تفسیر

سورۃ والتین

سُورَۃُ التِّین

مکیۃ ــــــــ آیات : ۸

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ ﴿۱﴾ وَطُوْرِ سِیْنِیْنَ ﴿۲﴾ وَھٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ ﴿۳﴾ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ﴿۴﴾ ثُمَّ رَدَدْنٰہُ اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ ﴿۵﴾ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَھُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ﴿۶﴾ فَمَا یُکَذِّبُکَ بَعْدُ بِالدِّیْنِ ﴿۷﴾ اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَحْکَمِ الْحٰکِمِیْنَ ﴿۸﴾

شاہد ہے انجیر اور زیتون اور طور سینین۔ اور یہ پرامن سرزمین کہ بے شک ہم نے آدمی کی ساخت اچھی سے اچھی بنائی۔ پھر ہم نے اسے ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ میں ڈال دیا۔ ہاں، مگر جو کہ ایمان لائے اور بھلائیاں کیں سو انھیں ہمیشہ کے لیے انعام ملے گا۔ سو اب کیا ہے جس سے تو جزا کو جھٹلاتا ہے۔ کیا خدا سب حاکموں سے بڑھ کر حاکم نہیں؟

۱۔ سورہ کے عمود اور اس کے مضمون اور نظم پر ایک اجمالی نظر

اس سورہ پر غور کرنے والے کو پہلی ہی نگاہ میں معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا عمود جزا کا اثبات ہے۔ یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ لوگوں کو ان کے اعمال کے مطابق جزا اور سزا دے گا۔ اس کا آغاز قسم سے ہوتا ہے اور ہم اپنی کتاب الامعان فی اقسام القرآن میں نہایت تفصیل کے ساتھ لکھ چکے ہیں کہ ان قسموں کی ایک خاص نوعیت ہے۔ ان کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ جس بات پر قسم کھائی گئی ہے اس پر، ان چیزوں کو جن کی قسم کھائی گئی ہے بطور شہادت پیش کیا جائے، عام قسموں کی طرح ان میں مقسم بہ (جس چیز کی قسم کھائی جائے) کی تعظیم مقصود نہیں ہوا کرتی۔

اس سورہ میں چار شہادتیں پیش کی ہیں اور یہ چاروں شہادتیں جزا کے ایسے واقعات کی طرف اشارہ کر رہی ہیں جو

اس دنیا میں پیش آتے تاکہ لوگ سونچیں کہ خداوند تعالیٰ بندوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے بلکہ وہ برابر عدل وانصاف کے ساتھ، لوگوں کو بدلہ دیتا رہتا ہے۔ ان واقعات سے یہ یقین پیدا ہوتا ہے کہ قیامت میں خداوند تعالیٰ ضرور بدلہ دے گا۔ جب دنیا میں جزا کی ایسی ایسی نمایاں مثالیں موجود ہیں تو آخرت میں اس کے واقع ہونے پر کیسے شبہ کیا جا سکتا ہے؟

قرآن مجید میں یہ طریقۂ استدلال بہت عام ہے۔ مثلاً:

وَالذّٰرِیٰتِ ذَرْوًا ۝ فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ۝ فَالْجٰرِیٰتِ یُسْرًا ۝ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ۝ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝ وَّاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ (سورہ ذاریات ۱-۶)

قسم ہے ان ہواؤں کی جو غبار اڑاتی ہیں، پھر مینہ کا بوجھ اٹھاتی ہیں، پھر آہستہ آہستہ چلتی ہیں۔ پھر اللہ کے حکم کو تقسیم کرتی ہیں کہ بے شک، وہ بات جس کی تم کو دھمکی دی جا رہی ہے ضرور سچ ہے اور جزا یقیناً واقع ہو کے رہے گی۔

دوسرے مقام پر فرمایا ہے:

یٰٓاَیُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ ۝ الَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۝ فِیْٓ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ۝ كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّیْنِ (۶-۹- سورۃ الانفطار)

اور آدمی تو کس بات پر بھولا ہے اپنے عالی مرتبہ آقا کی نسبت۔ جس نے تجھے بنایا، ٹھیک اور موزوں کیا جس طرز پر اس نے چاہا تجھے ترکیب دی مگر تم تو جزا کا انکار کرتے ہو۔

ان آیات پر غور کرو، اللہ تعالیٰ نے اپنے افعال کو شہادت میں پیش کر کے ثابت کیا ہے کہ وہ جزا و سزا دینے والا ہے۔ اسی اصول پر سورۂ تین میں جزا کے واقعات سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ قیامت کے دن وہ ضرور بدلہ دے گا۔ پھر دلیل لمی پر کلام کو ختم کیا۔ یعنی جزا کے وقوع پر اپنی صفات سے استدلال کیا اور یہ طریق استدلال، اگرچہ لوگوں نے اس کی طرف بہت کم توجہ کی، نہایت موثر اور پر زور ہے۔ اور اس میں استفہام کا اسلوب اختیار کیا ہے، جس کے سبب سے استدلال کا زور اور زیادہ بڑھ گیا۔ کیونکہ استفہام سے ظاہر ہوتا ہے کہ جزا کا نہ تسلیم کرنا انتہائی نادانی اور بے عقلی کی بات ہے۔ قرآن مجید میں یہ اسلوب بہت ہے۔ مثلاً

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ كَالْمُجْرِمِیْنَ ۝ مَا لَكُمْ كَیْفَ تَحْكُمُوْنَ (قلم ۳۵-۳۶)

کیا ہم فرمانبرداروں کو مجرموں کے برابر بنا دیں گے۔ تمھیں کیا ہو گیا ہے، کیسا فیصلہ کرتے ہو۔

كَیْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْیَاكُمْ (۲۸ - سورۃ البقرہ)

تم کیسے اللہ کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے تو خدا نے تم کو زندہ کیا۔

اَفِی اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

کیا آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے اللہ کے بارہ میں تمھیں شک ہے؟

اس کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں۔ اسی اصول پر یہاں دلیل لمی استفہام کی صورت میں بیان ہوئی ہے۔

ایک اور امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ یہاں جزا کی جو شہادتیں پیش کی گئی ہیں وہ جزا کے ایک ایسے پہلو کی طرف اشارہ کر

رہی ہیں جس سے ضمناً آنحضرت صلعم کی رسالت بھی ثابت ہو رہی ہے۔ کیونکہ یہ بات اپنی جگہ پر طے ہے کہ آنحضرت صلعم کی بعثت جزا کے اہم ترین واقعات میں سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اکثر جگہ نبوت کے اثبات پر یوں دلیل قائم کی گئی ہے کہ ایسا ہونا اللہ تعالیٰ کی رحمت اور عدل کے ظہور کے لیے ضروری ہے چنانچہ اس نے کسی قوم پر نبی کی بعثت سے پہلے عذاب نہیں نازل کیا، اور قیامت کے دن، جب تک انبیاء شہادت نہ دیں گے، کسی شخص کے معاملہ کا فیصلہ نہ ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی کی بعثت درحقیقت ایک روز جزا یا دوسرے لفظوں میں قیامت صغریٰ کا ظہور ہے۔ کیونکہ اس وقت ایک قوم فائز المرام ہوتی ہے اور دوسری فنا کر دی جاتی ہے۔ خدا کی طرف سے پوری طرح اتمام حجت ہو جاتا ہے اور لوگوں کے پاس کوئی عذر باقی نہیں رہ جاتا۔ چنانچہ فرمایا ہے:۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ (سورۃ النساء ۱۶۵)

رسول خوش خبری دیتے ہوئے ہوشیار کرتے ہوئے تاکہ انبیاء کے بعد لوگوں کے لیے اللہ کے خلاف کوئی حجت باقی نہ رہ جائے۔

اس پر مفصل بحث اپنے مقام پر ہو چکی ہے۔

اسی اصول پر یہاں بھی پچھلے واقعات جزا سے دو باتوں پر دلیل قائم کی ہے۔ ایک یہ کہ جزا ضرور واقع ہوگی۔ دوسری یہ کہ آنحضرت صلعم کی بعثت، اس عام سنۃ اللہ کے مطابق ہوئی ہے جو اس کائنات میں ہمیشہ سے جاری ہے۔

یہ سورہ کے عمود پر، جس پر قسم کھائی گئی ہے، ایک اجمالی نظر تھی اب اس اجمال کی تفصیلات آیندہ مختلف فصلوں میں تمھارے سامنے آئیں گی۔

۲- الفاظ کی شرح اور جملوں کی تاویل

(از آیت ۱ تا ۳)

وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ | ان دونوں کی شرح اگلی فصل میں آئے گی۔

اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ | تقویم کے معنی ہیں کسی چیز کو سیدھا کرنا۔ مثلاً کہیں گے قومت الرمح فاستقام (میں نے نیزے کو سیدھا کیا پس وہ سیدھا ہو گیا) یہیں سے یہ لفظ کسی شے کو کسی خاص مقصد کے لیے مناسب بنانے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ یعنی لفظ ظاہر سے باطن کی طرف منتقل ہو گیا۔ وہ تقویم ظاہری تھی۔ یہ تقویم معنوی ہوئی۔ اس معنی کے اعتبار سے اس کا مفہوم تسویہ کے مفہوم سے ملتا جلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مخلوق کا تسویہ فرماتا ہے۔ اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی (جس نے پیدا کیا اور اس کا تسویہ کیا) یعنی خدا نے کوئی مخلوق بے مقصد و غایت نہیں پیدا کی اور جو چیز پیدا کی ہے اس کی ساخت اور بناوٹ اس غایت و مقصد کے لیے بالکل موزوں بنائی ہے۔ پس اس اصل کو پیش نظر رکھنے کے بعد انسان کو احسن تقویم میں پیدا کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی ساخت ایک بہترین مقصد کے لیے بالکل مناسب بنائی ہے۔ یعنی اس کا تسویہ ایسے مناسب اور موزوں سانچہ پر فرمایا ہے کہ وہ اس قابل ہوا کہ اللہ تعالیٰ اس میں اپنی روح پھونکے۔

رَدَدْنٰهُ | ردّ، عربی میں مختلف مفہوموں کے لیے استعمال ہے۔ ایک مفہوم یہ ہے کہ کسی شے کو اس کی اصل حالت پر

پر لوٹا دینا۔ قرآن مجید ہے۔ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا (۱۰۹۔ سورۃ البقرہ) (وہ چاہتے ہیں کہ تمھارے ایمان لانے کے بعد تم کو دوبارہ کفر کی حالت میں لوٹا دیں) لفظ کا یہ مفہوم اس کے اصل معنی سے بہت قریب ہے۔ اصل معنی پر یہ آیت روشنی ڈالتی ہے یَرُدُّوْكُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ (۱۴۹ سورہ آل عمران) (کہ وہ تمھیں لوٹا دیں پیٹھ پیچھے پس تم نامرادوں میں سے بن جاؤ)

اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ 'اسفل' یا تو 'رَدَدْنٰهُ' کی ضمیر مفعول سے حال پڑا ہوا ہے۔ یا ظرف ہے۔ ظرف ہونے کی صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے ان کو دوبارہ پست ترین مقام میں لوٹا دیا جیسا کہ اس آیت میں ہے:

اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ (۴۲۔ سورۃ الانفال)

یہ وہ وقت تھا کہ تم (مسلمان میدان جنگ کے) ورلے سرے پر تھے اور وہ (کافر) پرلے سرے پر اور قافلہ تم سے نیچے کی طرف کو۔

لیکن دونوں تاویلوں میں معنی کے لحاظ سے کچھ فرق نہ ہوگا۔

اب رہا جملہ کی ترکیب کا سوال تو بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ مضاف مضاف الیہ کی ترکیب ہے لیکن یہ بات عربیت کے خلاف ہے۔ افعل کی اضافت جب نکرہ کی طرف ہو تو ضروری ہے کہ مضاف الیہ واحد ہو۔ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ اس لیے ظاہر ہے کہ 'سافلین' بھی ایک مستقل حال ہے خواہ 'اسفل' ظرف ہو یا حال۔ اسی وجہ سے یہ جمع ہونے کے باوجود نکرہ آیا۔ آیت کی تاویل کے لحاظ سے بھی یہی ترکیب زیادہ لگتی ہوئی معلوم ہوتی ہے کیونکہ حال ہونے کی صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ انسان نے یہ پستی خود اختیار کی۔ گویا اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا کہ ہم نے انسان کو پست ترین مقام میں لوٹا دیا اور حال یہ تھا کہ وہ خود پستی میں گرنا چاہتا تھا۔

اب پوچھو گے کہ "رَدَدْنٰهُ" میں ضمیر تو واحد ہے، پھر حال کو جمع کیوں لائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آیت میں انسان سے مراد نوع انسان ہے۔ اس وجہ سے معنی کا لحاظ کر کے حال کو جمع لائے۔ قرآن مجید میں اس کے نظائر بہت ہیں۔ مثلاً ایک جگہ سلسلہ کلام یوں ہے فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖ (۲۴۔ عبس) (انسان کو چاہیے کہ اپنے کھانے پر غور کرے) پھر اسی سے متصل فرمایا۔ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ (۳۲۔ عبس) (تمھارے اور تمھارے چوپایوں کے برتنے کے لیے) یہ 'لَكُمْ' اور 'اَنْعَامِكُمْ' میں جمع کی ضمیریں انسان ہی کی طرف لوٹتی ہیں۔ لیکن ان میں لفظ کا لحاظ نہیں بلکہ معنی کا لحاظ ہے۔

دوسرے مقام پر ہے۔

اَفَلَا يَعْلَمُ اِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُوْرِ وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ اِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيْرٌ (سورۃ العادیات)

تو کیا وہ نہیں جانتا جب قبریں اگلوائی جائیں گی اور دلوں کی باتیں نکلوائی جائیں گی کہ اس دن ان کا خداوند ان سے باخبر ہوگا۔

اس آیت میں 'يَعْلَمُ' واحد کا صیغہ ہے اس کی ضمیر بھی انسان ہی کی طرف لوٹتی ہے اور 'رَبَّهُمْ' اور 'بِهِمْ' میں جمع کی ضمیروں کا مرجع بھی انسان ہی ہے۔ ایک جگہ لفظ کے اعتبار سے واحد کا صیغہ استعمال ہوا، دوسری جگہ معنی کی رعایت

سے جمع کی ضمیریں آگئیں۔

گیارھویں فصل میں "اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ" کی تاویل پر ہم مفصل بحث کریں گے۔ یہاں یہ مختصر اشارات کافی ہیں۔

اِلَّا اس کے بارہ میں دو قول ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں یہ استثناء متصل ہے اور بعض کہتے ہیں یہ استدراک کے لیے ہے۔ یہ دوسرا قول زیادہ ظاہر ہے کیونکہ اس کے بعد جزا مذکور ہے۔ اس کی مثالیں قرآن مجید میں اور بھی ہیں۔ مثلاً:

فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ لَّسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ (سورۃ الغاشیہ)

سو تم یاددہانی کرو، تمھارا کام صرف یاددہانی کر دینا ہے تم ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو مگر جو اعراض کریں گے اور کفر میں پڑیں گے تو اللہ ان کو بڑا عذاب دے گا۔

دوسرے مقام پر ہے:

وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ (سورۃ الحجر)

اور ہم نے اس کو ہر راندۂ شیطان سے محفوظ کیا مگر جس نے کان لگایا تو اس کا پیچھا کرتا ہے ایک دمکتا ہوا شہاب۔

ان دونوں تاویلوں کا فرق گیارھویں فصل میں معلوم ہوگا۔

مَمْنُوْن 'مَنّ' سے ہے جس کے معنی کاٹ دینے کے ہیں۔ لبید کا مشہور مصرع ہے۔

غبر کواسب لا یمن طعامها

غَيْرُ مَمْنُوْنٍ یعنی دائم، غیر منقطع۔ جیسا کہ دوسرے مواقع پر فرمایا ہے لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ (۳۳۔ سورۃ الواقعہ) عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ (۱۰۸۔ سورہ ہود) یہ لفظ منت سے نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھا ہے۔ قرآن مجید میں اس معنی کی کوئی نظیر نہیں ہے۔ پھر منت کی نفی کیسے ہو سکتی ہے؟ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام اجر بھی تو فضل و منت ہی ہے۔

فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ کذب بالشیء، صدق بالشیء، کا ضد ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ بہت استعمال ہوا ہے۔ مثلاً اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ (۱۔ سورۃ الماعون) (بھلا دیکھا تم نے اس کو جو جزا کی تکذیب کرتا ہے) كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ (۹۔ سورۃ الانفطار) (ہرگز نہیں بلکہ جزا کو جھٹلاتے ہو) وَكَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ (۳۳۔ سورۃ المومنون) (اور انھوں نے آخرت میں خدا سے ملنے کی تکذیب کی) اسی طرح 'كَذَّبَهٗ بِهٖ' بھی مستعمل ہے۔ مثلاً:

فَقَدْ كَذَّبُوْكُمْ بِمَا تَقُوْلُوْنَ (سورہ الفرقان۔ ۱۹) انھوں نے تم کو جھٹلایا ان (تمام) باتوں میں جو تم کہتے ہو

ان تمام آیات میں تکذیب کی نسبت آدمیوں کی طرف ہے لیکن اس سورہ میں اس کی نسبت غیر عاقل چیزوں کی طرف کی گئی ہے۔ جو ممکن ہے اسی طرح کی نسبت ہو جس طرح شہادت اور نطق وغیرہ کی نسبت اشیاء کی طرف کی گئی ہے۔ مثلاً هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ (۲۹۔ سورۃ الجاثیہ) (یہ ہماری کتاب ہے جو تم پر ٹھیک ٹھیک گواہی دے رہی ہے) اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ ان واضح شہادتوں کے بعد اب کون سی چیز رہ گئی ہے جو شہادت دے رہی ہے کہ تم وقوع جزا کے متعلق اپنے دعویٰ میں جھوٹے ہو۔

ایک شکل یہ ہے کہ تکذیب کو حَمْلٌ عَلَى التَّكْذِيْبِ (یعنی تکذیب پر آمادہ کرنے) کے معنی میں لیا جائے جیسا کہ زمخشریؒ

کی رائے ہے لیکن قرآن مجید یا کلام عرب میں اس معنی کا کوئی سراغ مجھ کو نہیں ملا۔ اگر یہ معنی ثابت ہو جائیں تو نہایت صاف تاویل بن جاتی ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ اس کو آرزوئیں اور تمنائیں پیدا کرنے کے معنی میں لیا جائے جیسا کہ ایک مشہور جاہلی شاعر افنون نے استعمال کیا ہے۔

ولا خیر فیما کذب المرء نفسه   وتقواله للشیء یا لیت ذا لیا

(اس سے کیا حاصل کہ آدمی اپنے تئیں جھوٹی آرزوؤں میں بہلائے اور ہر چیز کے متعلق کہے کہ کاش وہ مجھے مل جائے)

عبید بن ابرص نے کہا ہے:

والمرء ما عاش فی تکذیب   طول الحیاة له تعذیب

(آدمی جب تک جیتا ہے آرزوؤں کے جال میں پھنسا رہتا ہے۔ اس کے لیے زندگی بھر عذاب ہے)

تکذیب جب متعدی ہو ان تین معنوں میں آئے گا۔ اب رہا یہ سوال کہ ان تینوں میں سے کون تاویل یہاں موقع کے لحاظ سے صحیح ہے تو اس کا جواب انشاء اللہ بارھویں فصل میں آئے گا۔

اَلدِّیْن دین کے معنی جزاء اور بدلہ کے ہیں۔ مشہور مصرع ہے دِنّاھُمْ کَمَا دَانُوْا (انھوں نے جیسا کیا ویسا پایا) اور مشہور مثل ہے کما تدین تدان (جیسا کرو گے ویسا پاؤ گے) قرآن مجید میں اس معنی کے شواہد بہت ہیں۔

۳۔ ان مقامات کی تعیین جن کی قسم کھائی گئی ہے

یہ بات اوپر بیان ہو چکی ہے کہ مقسم بہ (وہ چیز جس کی قسم کھائی جائے) پر اس حیثیت سے غور کرنا چاہیے کہ وہ مقسم علیہ (وہ بات جس پر قسم کھائی جائے) کی دلیل ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ یہ تمام مقامات جن کی اس سورہ میں قسم کھائی گئی ہے، اس پہلو سے باہم ایک مشترک نوعیت رکھتے ہوں۔ چنانچہ اگلی فصلوں میں جزا کے وہ واقعات ہم بیان کریں گے جو ان مقامات میں پیش آئے ہیں۔

تم تعجب کرو گے کہ ہم نے بغیر کسی تمہید کے ان کو "مقامات" کے لفظ سے تعبیر کر دیا ہے لیکن اس کے لیے ہمارے پاس دلائل ہیں جن میں سے بعض کی طرف ہم یہاں اشارہ کرتے ہیں۔

۱۔ آیندہ فصلوں میں جب جزا کے وہ واقعات بیان ہوں گے جو ان مقامات میں پیش آئے ہیں تو ان سے معلوم ہو گا کہ تین اور زیتون مقامات ہی کے نام ہو سکتے ہیں۔ اس کے سوا کوئی اور شکل ممکن نہیں ہے۔

۲۔ یہاں تین اور زیتون کو طور سینین اور بلد امین کے ساتھ لائے ہیں۔ یہ تعلق بھی نہایت واضح دلیل ہے کہ ان سے مراد مقامات ہی ہو سکتے ہیں

۳۔ علاوہ بریں اہل عرب مقامات و آثار سے عبرت پذیری کا خاص مذاق رکھتے ہیں۔ اس کا اندازہ ان کے اشعار کے مطالعہ سے کیا جا سکتا ہے۔ اس وجہ سے اگر مقامات کے ذکر سے ان واقعات کو یاد دلانا مقصود ہو، جو ان مقامات

میں پیش آئے ہیں، تو یہ بات عربوں کے مذاق کے بالکل مطابق ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں بکثرت مقامات کا ذکر ہوا ہے اور لوگوں کو ان کے احوال سنائے گئے ہیں۔

ذٰلِکَ الْقُرٰی نَقُصُّ عَلَیْکَ مِنْ اَنْبَآئِهَا (۱۰۱۔ سورۃ الاعراف) یہ بستیاں ہیں جن کے احوال ہم تم کو سناتے ہیں

۴۔ تورات میں بھی ایسے اشارات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے مراد مقامات ہی ہیں۔ نویں فصل میں ہم اس کی تفصیل کریں گے۔

اس تفصیل سے ہمارا مقصود یہ ہے کہ کسی کو یہ گمان نہ ہو کہ ہم نے تین اور زیتون کے معنی بدل دیے ہیں۔ نہیں، صرف یہ کیا ہے کہ لفظ کے معنی کے جو مختلف پہلو ہوتے ہیں، اس میں سے ایک پہلو کو اختیار کر لیا ہے اور زبان کے معروف قواعد کے لحاظ سے، جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے، ہم کو ایسا کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس سے وہ اختلاف بھی رفع ہو جاتا ہے جو حضرت عکرمہؓ کے دو قولوں میں نظر آتا ہے۔ یعنی ایک مرتبہ انھوں نے فرمایا کہ تین و زیتون سے یہی تمہارے انجیر و زیتون مراد ہیں اور ایک مرتبہ فرمایا کہ یہ دونوں دو پہاڑوں کے نام ہیں۔

اب ذیل میں ان کے متعلق ہم ضروری معلومات پیش کرتے ہیں۔

تین ایک خاص مقام کا نام ہے۔ عرب اس کو اسی نام سے جانتے تھے۔ تین انجیر کو کہتے ہیں چونکہ یہاں انجیر کی پیداوار بکثرت تھی اس وجہ سے یہ تین ہی کے نام سے مشہور ہو گیا۔ عربوں میں مقامات کے نام رکھنے کا یہ طریقہ بہت رائج تھا۔ جس چیز کی پیداوار جہاں زیادہ ہوتی، اسی نام سے اس مقام کو موسوم کر دیتے۔ مثلاً غضی۔ شجر۔ نخلہ وغیرہ۔ یہ لفظ کے اصل معنی سے نکل جانا نہیں ہے بلکہ جس طرح مظروف بول کو ظرف مراد لے لیتے ہیں اسی طرح لفظ کو اس کے مختلف پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کو خاص کر لینا ہے۔

مشہور شاعر نابغہ ذبیانی نے اپنے اشعار میں تین کا لفظ استعمال کیا ہے۔

صهبت الریح من تلقاء ذی ارل   تزجی مع اللیل فی صرادها صرما

صهب الظلال اتین التین عن عرض   یزجین غیما قلیلا ماده شبما

اس میں اس نے تین سے شمال کے ایک پہاڑ کو مراد لیا ہے۔ بعضوں نے کہا ہے کہ یہ حلوان اور ہمدان کے درمیان ہے۔ ابو حنیفہ دینوری کو اس رائے سے اختلاف ہے، وہ کہتا ہے کہ نابغہ بنی غطفان کا شاعر ہے اور یہ مقام بلاد غطفان سے بہت دور ہے۔ لیکن یہ اختلاف بالکل بے حقیقت ہے۔ شعرا اکثر ایسے مقامات کا ذکر کرتے ہیں جو ان کے ملک و وطن سے بہت دور ہوتے ہیں۔ یہی نابغہ، کابل، سدیا جوج اور تدمر وغیرہ کا ذکر کرتا ہے۔ کیا یہ مقامات بلاد غطفان سے قریب ہیں؟ اور جبل تین تو اگلوں کے قول کے مطابق، کچھ ایسا دور بھی نہیں، بلکہ عراق کے پڑوس ہی میں ہے۔ عرب کے شعراء، فرات، دجلہ خابور، خورنق اور سدیر وغیرہ کا گھر کی چیزوں کی طرح ذکر کرتے ہیں۔ شاید ابو حنیفہ کو "اتین التین" کے معنی سمجھنے میں دھوکا ہوا۔ اس نے سمجھا کہ نابغہ بادلوں کا اپنے وطن کی طرف آنا بیان کرتا ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے۔ نابغہ صرف بادلوں کا گزرنا بیان کرتا ہے۔ وہ ان ٹھنڈی شمالی ہواؤں کا ذکر کرتا ہے جو سرما کے ہلکے بادلوں کو جبل تین کے پاس ہنکائے پھرتی ہیں اور

جن سے ٹھنڈک اور زیادہ بڑھتی جاتی ہے۔ عرب شمال کی طرف سے ٹھنڈی ہواؤں کے چلنے کا ذکر اکثر کرتے ہیں۔ اور کوہ جودی تو ان کے ہاں سردی اور ٹھنڈک کا خاص مرکز ہے۔ ایک جاہلی شاعر ابوصعترہ بولانی کہتا ہے:

فما نطفة من حب مزن تقاذفت | به جنبتا الجودی والليل دامس
فما قرته اللصاب تنفست | شمال لاعلى مائه فهو قارس

بہرحال یہ قطعی ہے کہ نابغہ نے تین سے شمال کے کسی پہاڑ کو مراد لیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ جودی ہو یا اسی کے قریب کوئی دوسرا پہاڑ۔

جو غلطی دینوری نے نابغہ کے شعر کے سمجھنے میں کی ہے، ٹھیک وہی غلطی صاحب معجم البلدان نے ابوصعترہ کے شعر کے سمجھنے میں کی ہے۔ صاحب معجم البلدان کا خیال ہے کہ ابوصعترہ نے جودی سے یمن کا کوئی مقام مراد لیا ہے۔ اس خیال کی بنیاد محض یہ ہے کہ شعراء اپنے وطن سے دور کے مقامات کا ذکر نہیں کرتے حالانکہ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ ہم اوپر اس خیال کی غلطی دلائل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔ پھر یہ بھی معلوم ہے کہ جودی نام کا کوئی پہاڑ یمن میں نہیں ہے۔ اس لیے لازماً اسی جودی کو تسلیم کرنا پڑے گا جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ اس آیت کی تاویل میں حضرت عباسؓ سے جو قول مروی ہے اس سے بھی ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد حضرت نوح علیہ السلام کی وہ مسجد ہے جو کوہ جودی پر بنی تھی۔ اور حضرت عکرمہؒ کا قول سن چکے ہو کہ تین اور زیتون دو پہاڑ ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ تین سے مراد یا تو کوہ جودی ہے یا اسی کے قریب کوئی دوسرا پہاڑ ہے۔ تورات میں ہے کہ بنی آدم نوح علیہ السلام کے بعد ادھر ادھر متفرق ہوئے اور قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ کوہ جودی کے پاس آیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جبل تین حضرت آدمؑ اور ان کی ذریت کا مسکن تھا۔ اس قیاس کی مزید تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ تورات میں ہے کہ آدم اپنے آپ کو ڈھانکنے کے لیے اپنے اوپر انجیر کی پتیاں سی لیتے تھے۔

وَالزَّيْتُونِ ہمارے نزدیک یہ بھی مقام کا نام ہے۔ چونکہ زیتون کی پیداوار یہاں زیادہ تھی اس وجہ سے عربوں کے اس طریق تسمیہ کے مطابق جس کا اوپر ہم نے ذکر کیا ہے یہ زیتون کے نام سے موسوم ہو گیا۔ زیتون یقیناً وہی پہاڑ ہے جس کا انجیل میں اکثر ذکر آتا ہے اور جس پر حضرت مسیح علیہ السلام نے بارہا دعائیں کی ہیں۔ لوقا ۲۱: ۳۷ میں ہے۔

"اور دن میں وہ ہیکل میں تعلیم دیتا تھا اور رات میں نکل جاتا تھا اور اس پہاڑ پر شب بسر کرتا تھا جس کا نام کوہ زیتون ہے۔"

چھٹی فصل میں اس کی تفصیلات سامنے آئیں گی۔

اقوال سلف سے بھی اس رائے کی تائید ہوتی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت کعبؓ سے مروی ہے کہ زیتون سے مراد بیت المقدس ہے اور قتادہؒ فرماتے ہیں کہ زیتون وہ پہاڑ ہے جہاں بیت المقدس واقع ہے۔ (ابن جریر)

طُوْرِ سِيْنِيْنَ معلوم و مشہور ہے لیکن لفظ کی ہیئت میں ایسا تصرف ہو گیا ہے کہ اس کی توضیح نہایت ضروری ہے۔ قرآن نے اس کو ایک جگہ طور سینا بھی کہا ہے۔ یعنی ایک جگہ وہ مونث کی صورت میں ہے اور دوسری جگہ جمع سالم کی شکل میں۔ اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ اس کی تانیث اس وجہ سے ہے کہ یہ جمع کی صفت ہے۔ جیسے عربی میں جمعا اور اجمعون

مستعمل ہیں۔ تورات میں کہیں سینا آیا ہے، کہیں سینیم۔ اور معلوم ہے کہ عبرانی زبان میں یم جمع کی علامت ہے۔ بعض علماء اہل کتاب کہتے ہیں کہ سینیم سرزمین چین کا نام ہے۔ دلیل یہ ہے کہ سینیم کوئی ایسی جگہ ہونی چاہیے جو فلسطین سے دور ہو لیکن اس دلیل کی لغویت بالکل واضح ہے۔

بَلَدِ الْأَمِيْنِ اس کی توضیح کی ضرورت نہیں ہے البتہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مکہ کیوں نہیں کہا بلد امین کیوں کہا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مقصود شہادت پیش کرنا ہے اور اس مقصود کے لیے مناسب یہی تھا کہ بلد امین کہا جائے مکہ نہ کہا جائے۔ آٹھویں فصل میں اس کی وضاحت ملے گی۔

۴۔ شہادت کے متعلق ایک اصولی بات

اوپر گزر چکا ہے کہ جس چیز کی قسم شہادت کے لیے کھائی جائے اس پر صرف اسی پہلو سے غور کرنا چاہیے جس پہلو سے اس کا دلیل و شہادت ہونا واضح ہو۔ اس سورہ میں معلوم ہے کہ جس بات پر قسم کھائی گئی ہے وہ جزاء کا معاملہ ہے۔ اس لیے ہم کو ان ناموں پر جن کی قسم کھائی گئی ہے، اسی پہلو سے غور کرنا ہے۔

ایک اور بات بھی نگاہ میں رکھنی چاہیے کہ بعض اوقات ایک ہی چیز میں شہادت کے مختلف پہلو ہوتے ہیں۔ مثلاً بارش کو کہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی پروردگاری کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔ کہیں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے کی دلیل کے طور پر۔ اسی طرح بعض چیزوں کے متعلق بالاجمال صرف اس قدر کہہ دیا ہے کہ اس میں بہت سے دلیلیں پوشیدہ ہیں، مثلاً فرمایا:

هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ	وہی ہے جس نے رات کو تمھارے لیے (تاریک) بنایا، تاکہ تم اس میں سکون حاصل کرو اور دن کو روشن بنایا (تاکہ تم اس میں کام کرو) بے شک اس کے اندر بہت سی نشانیاں ہیں۔

فرمایا "بہت سی نشانیاں ہیں" صرف ایک ہی نشانی نہیں ہے۔ دوسرے مقام پر فرمایا:

إِنَّ فِي اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ	بے شک رات اور دن کی آمد و شد میں بہت سی نشانیاں ہیں۔

اس قسم کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ملیں گی۔ بایں ہمہ جب کسی چیز کی قسم شہادت کے لیے کھائی جائے، تو اس وقت مقسم بہ کے صرف اسی پہلو پر غور کرنا چاہیے جو مقسم علیہ سے مناسبت رکھتا ہے۔ اس کے دوسرے پہلوؤں کو نظر انداز کر دینا چاہیے۔

یہ اصولی حقیقت سمجھ لینے کے بعد یہ بات جاننی چاہیے کہ یہ چاروں مقامات، جن کی اس سورہ میں قسم کھائی گئی ہے، ان مقامات میں سے ہیں، جن میں جزا کے نہایت اہم واقعات پیش آئے ہیں۔ ان واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو، ان کے اعمال کے مطابق، انصاف اور رحم کے ساتھ، جزا اور سزا دیتا ہے۔

شہادت کے لیے جو قسمیں کھائی جاتی ہیں ان کے بارہ میں اس کلیہ کو نگاہ میں رکھو۔ آئندہ فصلوں میں تمھیں جو تفصیلات ملیں گی ہم ان میں اس اصول کو پیش نظر رکھیں گے۔

۵ - جبلِ تین کی شہادت جزاء پر

تین وہ پہلا مقام ہے جہاں انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جزاء اور سزا کا معاملہ پیش آیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب آدم علیہ السلام نے خدا کا عہد بھلا دیا اور اپنے حاسد (شیطان) کی بات مان لی، ان کو اور ان کی بیوی کو جزا کے قانون سے دوچار ہونا پڑا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی سرفرازی سے محروم کر دیا اور جنت کا خلعت، جو ان کو بخشا گیا تھا، ان سے چھین لیا گیا۔ چنانچہ فرمایا ہے وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِن وَّرَقِ الْجَنَّةِ (اور وہ اپنے اوپر جنت کے پتے سینے لگے) اور یہ واقعہ ان کی پوری نسل کے لیے ایک یادگار واقعہ قرار پایا۔ چنانچہ قرآن مجید میں مختلف جگہ اس کو اسی حیثیت سے یاد دلایا گیا ہے۔ مثلاً فرمایا۔ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا (اے آدم کے بیٹو! کہیں تم کو شیطان ورغلا نہ دے جس طرح اس نے تمہارے ماں باپ کو ورغلا کر جنت سے نکال دیا، ان کے جنت کے خلعت سے ان کو محروم کر کے) علاوہ ازیں یہ بات بھی نگاہ میں رکھو کہ حضرت آدمؑ اور حوا نے جس درخت کے پتوں سے اپنے بدن ڈھانکے تھے، توریت میں تصریح ہے کہ وہ انجیر کا درخت تھا۔

پھر قرآن میں تصریح ہے کہ آدمؑ اور حوا نے اس وقت توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی اور ان پر ہدایت نازل کرنے اور اس ہدایت کی پیروی کرنے والوں کو اجر دینے کا وعدہ فرمایا۔

پہلے عہد کے بعد یہ اللہ تعالیٰ کا دوسرا عہد تھا جو اس نے آدم سے باندھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جبل تین کا واقعہ اپنے اندر دو بالکل متضاد خصوصیات رکھتا ہے۔ اس دن اللہ تعالیٰ نے ایک طرف حضرت آدم سے اپنی ایک نعمت چھینی اور دوسری طرف ایک عظیم الشان نعمت ان کو بخشی۔ چھینی اس لیے کہ انھوں نے خدا کے پہلے عہد کو فراموش کر دیا تھا اور بخشی اس لیے کہ غفلت کے بعد وہ متنبہ ہو گئے اور انھوں نے توبہ کی۔

جبل تین کے پاس جزاء کا دوسرا واقعہ حضرت نوح علیہ السلام کے عہد میں پیش آیا۔ ان کے زمانہ میں اسی مقام پر اللہ تعالیٰ نے ظالموں کو تباہ کیا اور نیکو کاروں کو طوفان سے نجات دی اور ان کو برکت بخشی۔ قرآن مجید میں ہے

وَقِيْلَ يٰٓاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ الْمَآءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (ھود - ۴۴)

اور حکم دیا گیا اے زمین اپنا پانی جذب کر لے۔ اور اے آسمان تھم جا اور پانی اتر گیا اور کام تمام کر دیا گیا اور کشتی کوہ جودی پر تھم گئی اور اعلان کر دیا گیا کہ ہلاکی ہو ظالموں کے لیے۔

آگے حضرت نوح علیہ السلام کی دعا کے ذکر کے بعد فرمایا۔

قِيْلَ يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَكَ ۭ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمْ ثُمَّ يَمَسُّهُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۔ (ھود - ۴۸)

کہا گیا اے نوح اترو، ہماری طرف سے سلامتی اور برکتوں کے ساتھ اپنے اوپر اور ان قوموں پر جو تمہارے ساتھ ہیں اور تمہارے ماسوا اور قومیں بھی ہوں گی جن کو ہم کچھ دن تک متمتع ہونے کا موقع دیں گے پھر ان کو ہمارا دردناک عذاب پکڑے گا۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی برکت و رحمت تمہارے لیے اور ان لوگوں کے لیے ہے جو تم پر ایمان لائے۔ باقی ان کے علاوہ جو لوگ ہیں ان کے لیے دنیا کی متاعِ قلیل کا حصہ ہے اور اس کے بعد آخرت کا عذاب دردناک۔

اس سے معلوم ہوا کہ جبل تین اللہ تعالیٰ کے قانون جزاء کے ظہور کا ایک یادگار مقام ہے اور اس کو تین کے نام سے ذکر کیا ہے سعیر کے نام سے ذکر نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تین کے لفظ سے جزاء کا وہ واقعہ بھی نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے جو طوفان سے بہت پہلے پیش آیا۔ اس کے علاوہ اس نام میں اور بھی بعض خوبیاں ہیں جن کی تفصیل آگے آئے گی۔

۶ - کوہِ زیتون کی شہادت جزاء پر

کوہ زیتون پر جزاء کا ایک نہایت عظیم الشان واقعہ پیش آیا ہے۔ اسی پہاڑ پر خدا نے یہود سے اپنی شریعت کی امانت چھینی اور وہ امانت سلسلہ ابراہیمی کی ایک دوسری شاخ کے حوالہ کر دی۔ یہ واقعہ حضرت مسیح علیہ السلام کے آخر زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک روز وہ شب بھر جاگ کر خدا سے دعا و مناجات کرتے رہے کہ ان کی قوم کی کشتی غرق ہونے سے بچ جائے لیکن تقدیر کا فیصلہ اٹل تھا۔ بالآخر وہ قوم کے مستقبل سے مایوس ہو گئے۔ اور جب آپ کو یہ معلوم ہوا کہ یہود آپ کے قتل کے درپے ہیں تو آپ کو نہایت غم ہوا، کیونکہ آپ جانتے تھے کہ اس اقدام کے بعد یہود پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو جائے گی۔ اور خدا اپنی امانت ان سے چھین کر دوسروں کے حوالہ کر دے گا۔ متی ۲۱: ۴۲ میں ہے۔

"یسوع نے ان سے کہا کیا تم نے کتاب مقدس میں کبھی نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے۔"

یہ پوری عبارت زبور ۱۱۸: ۲۲ - ۳۲ سے منقول ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس کا حوالہ دے کر اپنی طرف سے اس کی شرح فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں۔

"اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہی تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے، دے دی جائے گی (۴۳) اور جو اس پتھر پر گرے گا ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا لیکن جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا۔"

یہ آسمانی بادشاہت کے چھینے جانے کا واقعہ کوہ زیتون پر پیش آیا۔ انجیلوں میں اس کی تمام تفصیلات موجود ہیں۔

لوقا ۲۲: ۳۹ - ۵۲ میں ہے:

"پھر وہ نکل کر اپنے دستور کے موافق زیتون کے پہاڑ کو گیا اور شاگرد اس کے پیچھے ہو لیے اور اس جگہ پہنچ کر اس نے ان سے کہا کہ دعا کرو کہ آزمائش میں نہ پڑو[1] اور وہ ان سے بمشکل الگ ہو کر کوئی پتھر کا ٹپہ آگے بڑھا اور گھٹنے ٹیک کر یوں دعا کرنے لگا کہ اے باپ اگر تو چاہے تو یہ پیالہ مجھ سے ہٹا لے تو بھی میری مرضی نہیں بلکہ تیری ہی مرضی پوری ہو۔ اور آسمان سے ایک فرشتہ دکھائی دیا۔ وہ اسے تقویت دیتا تھا۔ پھر وہ سخت پریشانی میں مبتلا ہو کر اور بھی دل سوزی سے دعا کرنے لگا اور اس کا

---

[1] یعنی وہ فتنہ جو یہود کی تمام عظمت خاک میں ملا دے گا۔ جس کے بعد وہ ایک ملعون قوم بن جائیں گے۔ قرآن مجید کی یہ آیت اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَصَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ (منہ)

پسینہ گویا خون کی بڑی بڑی بوندیں ہو کر زمین پر ٹپکتا تھا۔ جب دعا سے اٹھ کر شاگردوں کے پاس آیا تو انھیں غم کے مارے سوتے پایا ٥ اور ان سے کہا تم سوتے کیوں ہو؟ اٹھ کر دعا کرو تاکہ آزمائش میں نہ پڑو ٥ وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ دیکھو ایک بھیڑ آئی اور ان بارہ میں سے وہ جس کا نام یہوداہ تھا ان کے آگے آگے تھا وہ یسوع کے پاس آیا کہ اس کا بوسہ لے ٥ یسوع نے اس سے کہا اے یہوداہ کیا تو بوسہ لے کر ابن آدم کو پکڑواتا ہے؟ جب اس کے ساتھیوں نے معلوم کیا کہ کیا ہونے والا ہے تو کہا اے خداوند کیا ہم تلوار چلائیں اور ان میں سے ایک نے سردار کاہن کے نوکر پر تلوار چلا کر اس کا داہنا کان اڑا دیا ٥ یسوع نے جواب میں کہا اتنے پر کفایت کرو اور اس کے کان کو چھو کر اس کو اچھا کیا ٥ پھر یسوع نے سردار کاہنوں، اور ہیکل کے سرداروں اور بزرگوں سے جو اس پر چڑھ آئے تھے کہا کیا تم مجھے ڈاکو جان کر تلواریں اور لاٹھیاں لے کر نکلے ہو؟ جب میں ہر روز ہیکل میں تمھارے ساتھ تھا تو تم نے مجھ پر ہاتھ نہ ڈالا لیکن یہ تمھاری گھڑی اور تاریکی کا اختیار ہے؟

اس عظیم الشان واقعہ کی تفصیلات مرقس اور متی دونوں انجیلوں میں بیان ہوئی ہیں، اور ایک میں واقعہ کے جو اجزا مذکور ہوئے ہیں دوسرے میں نہیں ہیں، اس وجہ سے ہم دونوں کو پیش نظر رکھ کر واقعہ کی تمام تفصیل یک جا کیے دیتے ہیں۔ اس کی طوالت سے گھبرانا نہ چاہیے۔ اس کی اہمیت چاہتی ہے کہ اس کی پوری تفصیل کر دی جائے۔

مرقس ۱۴: ۳۲-۴۲ میں ہے:

اور پطرس اور یعقوب اور یوحنا کو اپنے ساتھ لے کر نہایت حیران اور بے قرار ہونے لگا ٥ اور ان سے کہا میری جان نہایت غمگین ہے یہاں تک کہ مرنے کی نوبت پہنچ گئی ہے۔ تم یہاں ٹھہرو اور جاگتے رہو ٥ اور وہ تھوڑا آگے بڑھا اور زمین پر گر کر دعا کرنے لگا کہ اگر ہو سکے تو یہ گھڑی مجھ پر سے ٹل جائے۔ اور کہا اے ابا اے باپ! تجھ سے سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اس پیالہ کو میرے پاس سے ہٹا لے تو بھی جو میں چاہتا ہوں وہ نہیں بلکہ جو تو چاہتا ہے وہی ہو ٥ پھر وہ آیا اور انھیں سوتے پا کر پطرس سے کہا اے شمعون تو سوتا ہے؟ کیا تو ایک گھڑی بھی نہ جاگ سکا؟ جاگو اور دعا کرو تاکہ آزمائش میں نہ پڑو روح تو مستعد ہے مگر جسم کمزور ہے ٥ وہ پھر چلا گیا اور وہی بات کہہ کر دعا کی ٥ اور پھر آ کر انھیں سوتے پایا کیونکہ اس کی آنکھیں نیند سے بھری تھیں اور وہ نہ جانتے تھے کہ اسے (اس جھڑکی پر کیا جواب دیں)، پھر تیسری بار آ کر ان سے کہا اب سوتے رہو اور آرام کرو بس وقت آ پہنچا ہے[1]۔ دیکھو ابن آدم گنہگاروں کے ہاتھ میں حوالہ کیا جاتا ہے، اٹھو چلیں۔“

آگے کا بیان اوپر کے بیانات سے ملتا جلتا ہے۔

متی ۲۶: ۳۶-۴۵ میں بھی بالکل یہی ہے صرف اتنی بات اس میں نئی ہے کہ اس میں سجدہ کی تصریح ہے اور لوقا میں صرف رکوع کا ذکر ہے۔ اس کا ثبوت اس فقرہ میں ملتا ہے۔ ”پھر ذرا آگے بڑھا اور منہ کے بل گر کر یہ دعا کی“۔

یوحنا میں دعا کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ البتہ اس موقع پر اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی بعض ایسے فقرے ملتے ہیں جو دوسری انجیلوں میں نہیں ہیں اور جگہ جگہ بعض جھوٹے اضافے بھی اس میں ہیں۔ ہم آگے اس کے بعض ضروری اقتباسات پیش کرتے ہیں، جن سے ایک طرف یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ کلام اسی حادثہ کے وقت کا ہے جب کہ یہود کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا،

[1] یعنی اب یہود کی تباہی کا آخری وقت آن پہنچا ہے اور ان کے اعمال کی سیاہی اب ان پر چھا جانے والی ہے اور میری دعاؤں کا ترکش خالی ہو چکا۔ (منہ)

دوسری طرف اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عذاب میں ایک پہلو رحمت کا بھی تھا۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لیے مخصوص کر دیا تھا جو بعد میں نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے تھے۔ تورات میں اس کا ذکر بار بار آیا ہے اور قرآن نے سورۂ اعراف کی آیات ذیل میں اس کی پوری تصریح کر دی ہے۔

قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ٥ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ٥ (الاعراف: ۱۵۶-۱۵۷)

کہا اپنا عذاب میں جس پر چاہتا ہوں نازل کرتا ہوں اور میری رحمت ہر چیز کو شامل ہے پس میں اس کو ان لوگوں کے لیے لکھ رکھوں گا جو پرہیزگاری اختیار کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور جو ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے — وہ جو پیروی کرتے ہیں رسول نبی امی کی جس کو لکھا ہوا پاتے ہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں وہ ان کو حکم دیتا ہے اچھی بات کا اور روکتا ہے بری بات سے حلال کرتا ہے ان کے لیے پاک چیزیں اور حرام کرتا ہے ناپاک چیزیں۔ اور دور کرتا ہے ان سے ان کے وہ بوجھ اور پھندے جو ان پر تھے۔ پس جو لوگ اس پر ایمان لائے اس کی حمایت کی اور اس کی مدد کی اور پیروی کی اس روشنی کی جس کو دے کر وہ بھیجا گیا ہے تو وہی لوگ کامیاب ہیں۔

اب یوحنا ۱۲: ۲۳-۳۶ کی مندرجہ ذیل آیتیں پڑھو۔

یسوع نے جواب میں ان سے کہا وہ وقت آ گیا کہ ابن آدم جلال پائے ٥ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک گیہوں کا دانہ زمین میں گر کر مر نہیں جاتا اکیلا رہتا ہے لیکن جب مر جاتا ہے تو بہت سے پھل لاتا ہے ٥ جو اپنی جان کو عزیز رکھتا ہے وہ اسے کھو دیتا ہے اور جو دنیا میں اپنی جان سے عداوت رکھتا ہے وہ اسے ہمیشہ کی زندگی کے لیے محفوظ رکھے گا ٥ اگر کوئی شخص میری خدمت کرے تو میرے پیچھے ہو لے اور جہاں میں ہوں وہاں میرا خادم بھی ہوگا۔ اگر کوئی میری خدمت کرے تو باپ اس کی عزت کرے گا ٥ اب میری جان گھبراتی ہے۔ پس میں کیا کہوں؟ اے باپ مجھے اس گھڑی سے بچا لیکن اسی سبب سے تو اس گھڑی کو پہنچا ہوں[1] ٥ اے باپ اپنے نام کو جلال دے پس آسمان سے آواز آئی کہ میں نے اس کو جلال دیا ہے اور پھر بھی دوں گا ٥ جو لوگ کھڑے سن رہے تھے انھوں نے کہا کہ بادل گرجا اوروں نے کہا کہ فرشتہ اس سے ہمکلام ہوا ٥ یسوع نے جواب میں کہا کہ یہ آواز میرے لیے نہیں بلکہ تمھارے

[1] اس پریشانی کا باعث دو باتیں تھیں۔ یہود کی بدبختی اور تباہی، جس کی آخری گھڑی سر پر آ چکی تھی اور اپنی تذلیل کا اندیشہ جو یہود کے ہاتھوں ہونے والی تھی۔ پہلی بات تو معلوم تھی۔ اس کے واقع ہونے میں کوئی شبہ نہ تھا۔ دوسری بات اس لیے وجہ پریشانی تھی کہ یہ اہانت درحقیقت ان کی ذات کی اہانت نہ تھی بلکہ باطل کے مقابل میں حق کی اہانت تھی جو لوگوں کے لیے ایک نہایت سخت آزمائش تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی مومنین کو باطل کے غلبہ کا اندیشہ ہوا انھوں نے حق کی فتحمندی اور آزمائش سے بچنے کی دعائیں مانگیں۔ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ٥ دوسری جگہ ہے رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔ حضرت عیسیٰؑ کے آگے کے فقرے کو غور سے پڑھو وہ بھی اسی طرح کی دعا ہے۔ منہ

لیے آئی ہے[1] ○ اب دنیا کی عدالت کی جاتی ہے۔ اب دنیا[2] کا سردار نکال دیا جائے گا ○ اور میں اگر زمین سے اونچے پر چڑھا دیا جاؤں گا تو سب کو اپنے پاس کھینچوں گا ○ اس نے اس بات سے اشارہ کیا کہ میں کس موت سے مرنے[3] کو ہوں۔ لوگوں نے اس کو جواب دیا کہ ہم نے شریعت کی یہ بات سنی ہے کہ مسیح ابد تک رہے گا، پھر تو کیونکر کہتا ہے کہ ابن آدم کا اونچے پر چڑھایا جانا ضرور ہے۔ یہ ابن آدم کون ہے؟ پس یسوع نے ان سے کہا کہ اور تھوڑی دیر تک نور تمہارے[4] درمیان ہے۔ جب تک نور تمہارے ساتھ ہے چلے چلو۔ ایسا نہ ہو کہ تاریکی تمھیں آ پکڑے اور جو تاریکی میں چلتا ہے وہ نہیں جانتا کہ کدھر جاتا ہے ○ جب تک نور تمہارے ساتھ ہے نور پر ایمان لاؤ تاکہ نور کے فرزند بنو۔

یسوع یہ باتیں کہہ کر چلا گیا اور ان سے اپنے آپ کو چھپایا[5]۔

باب ۱۶: ۵ - ۱۳ میں ہے:

مگر اب میں اپنے بھیجنے والے کے پاس جاتا ہوں اور تم میں سے کوئی مجھ سے نہیں پوچھتا کہ تو کہاں جاتا ہے۔ بلکہ اس لیے کہ میں نے یہ باتیں تم سے کہیں تمہارا دل غم سے بھر گیا ○ لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا۔ لیکن اگر جاؤں گا تو اس کو تمہارے پاس بھیج دوں گا۔ اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور راست بازی اور عدالت کے بارہ میں قصوروار ٹھہرائے گا ○ گناہ کے بارہ میں اس لیے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لاتے ○ راست بازی کے بارہ میں اس لیے کہ میں باپ کے پاس جاتا ہوں اور تم مجھے پھر نہ دیکھو گے ○ عدالت کے بارہ میں اس لیے کہ دنیا کا سردار مجرم ٹھہرایا گیا ہے[6]۔ مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے ○ لیکن جب وہ یعنی روحِ حق آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔

باب ۱۶: ۲۰ میں ہے:

میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ تم روؤ گے اور ماتم کرو گے مگر دنیا خوش ہو گی۔ تم غمگین تو ہو گے لیکن تمہارا غم ہی خوشی بن جائے گا ○ جب عورت جننے لگتی ہے تو وہ غمگین ہوتی ہے اس لیے کہ اس کے دکھ کی گھڑی آپہنچی، لیکن جب بچہ پیدا ہو چکتا ہے

---

[1] یعنی اللہ تعالیٰ مجھ کو اٹھا لے گا اور شریروں کے ہاتھوں گرفتار نہ کرائے گا تاکہ تم آزمائش سے محفوظ رہو۔ منہ [2] دنیا سے مراد یہاں یہود ہیں۔ "نکال دیئے" سے مقصود یہ ہے کہ اب امانت شریعت ان سے چھین لی جائے گی۔ چنانچہ اسی وقت سے وہ دینی پیشوائی کی عزت سے محروم کر دیے گئے۔ [3] یہ راویوں کا اضافہ ہے۔ حضرت مسیح نے مرنے کا ذکر نہیں کیا، اٹھائے جانے کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے ہر جگہ یہی فرمایا ہے۔ [4] یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کتاب کی روشنی ان سے جلد چھین جائے گی اور اس کے بعد یہ روشنی اس پیغمبر کے ساتھ آئے گی جس کی حضرت مسیح نے بشارت دی ہے۔ اعراف کی آیت وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ منہ [5] واقعہ کی اصل صورت یہی ہے لیکن یوحنا کے سوا کسی نے اس طرح نہیں بیان کیا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام غائب ہو گئے۔ یہود ان کو گرفتار نہ کر سکے۔ میرے نزدیک حضرت مسیح علیہ السلام کے غائب ہو جانے پر واقعات کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن راویوں نے اس میں ملا جلا کر ایک پورا گورکھ دھندا بنا دیا ہے۔ منہ۔

[6] یعنی یہود حضرت مسیح علیہ السلام پر ایمان نہ لائے۔ منہ

تو اس خوشی سے کہ دنیا میں ایک آدمی پیدا ہوا اس درد کو پھر یاد نہیں کرتی[1] ○

باب ۱۶: ۳۲ میں ہے:

دیکھو وہ گھڑی آتی ہے بلکہ آپہنچی کہ تم سب پراگندہ ہو کر اپنے اپنے گھر کی راہ لو گے اور مجھے اکیلا چھوڑ دو گے تو بھی میں اکیلا نہیں ہوں کیونکہ باپ میرے ساتھ ہے۔

اس کے بعد آپ کی دعا نقل کی ہے..... پھر کاہنوں کے زغہ اور یہودا کی جاسوسی کا واقعہ بیان کیا ہے اور یہ حصہ بالکل اس بیان کے مطابق ہے جو دوسری انجیلوں میں ملتا ہے۔ حالانکہ یہ ٹکڑا صاف اضافہ معلوم ہوتا ہے۔ آپ کے غائب ہو جانے اور چھپ جانے کے ذکر کے بعد یہ بات بالکل بے جوڑ سی معلوم ہوتی ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ زیتون میں جزاء کا کیسا عظیم الشان واقعہ پیش آیا ہے۔ یہی مقام ہے جہاں ایک قوم دھتکاری جاتی ہے اور دوسری پیار کے ساتھ بلائی جاتی ہے۔ یہیں رحمت و نقمت اور نور و ظلمت کے کرشمے ایک ساتھ دیکھے جاتے ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی مضطربانہ دعائیں، ان کی گریہ وزاریاں کتنی درد انگیز ہیں! شمع آخر شب میں کس زور سے بھڑک اٹھی ہے! انھوں نے امت کے لیے اپنی روح انڈیل دی اور اپنی رگ رگ کا زور صرف کر دیا۔ لیکن تقدیر کا فیصلہ اٹل رہا اور غم کا پہاڑ اپنی جگہ سے ذرا بھی نہ سرکا۔

علاوہ بریں زیتون کے لفظ سے اس واقعۂ جزاء کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں پیش آیا ہے۔ اس کی تفصیلات آگے آئیں گی۔

۷۔ طور سینین کی شہادت جزاء پر

'طور سینین' میں جزاء کی شہادت کا پہلو بالکل واضح ہے۔ یہی مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے ایک مظلوم و مقہور قوم پر اپنی عنایت مبذول فرمائی، اور اس کے صبر و برداشت کے صلہ میں اس کے دشمنوں کے پنجوں سے اس کو نجات دے کر اس کا سر اونچا کیا اور پھر اس کو ایک ایسی شریعت عطا فرمائی جو منکروں اور دشمنوں کے لیے یکسر تازیانۂ عذاب تھی۔ یہ واقعہ مظلوموں پر لطف و نوازش اور ظالموں پر قہر و غضب کی ایک نہایت واضح مثال ہے۔ قرآن مجید میں فرعون اور اس کی قوم کے واقعات جہاں بیان ہوئے ہیں وہاں جا بجا اس بات کی طرف اشارات ملتے ہیں۔

فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ۝ فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّمَثَلًا لِّلْاٰخِرِيْنَ (الزخرف - ۵۴-۵۶)	پس اس نے (فرعون نے) اپنی قوم کو بے وقوف بنایا اور (وہ) اس کے کہنے میں آگئی۔ بے شک وہ لوگ نافرمان تھے۔ پس جب ان لوگوں نے ہم کو غصہ دلا دیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا اور ان سب کو غرق کر دیا اور ان کو گیا گزرا اور آنے والی نسلوں کے لیے کہاوت بنا دیا۔

---

[1] اپنی غیبت کے زمانہ کو دردِ زہ کے زمانہ سے اور نبی موعود علیہ السلام کے ظہور کے زمانہ کو ولادت کے زمانہ سے تشبیہ دی ہے۔

دوسری جگہ ہے:

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ بِمَا صَبَرُوْا ۭ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ۝ (الاعراف - ۱۳۷)

اور تمھارے رب کا وعدۂ نیک بنی اسرائیل کے پے پورا ہوا بوجہ اس کے کہ وہ ثابت قدم رہے اور ہم نے تباہ کر ڈالیں وہ عمارتیں جو فرعون اور اس کی قوم کے لوگ بناتے تھے اور وہ بیلیں جو وہ ٹٹیوں پر چڑھاتے تھے۔

ایک اور مقام میں ہے:

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَاۗىِٕفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَاۗءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَاۗءَهُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَي الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَىِٕمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ ۝ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ ۝ (القصص - ۴-۶)

بے شک فرعون نے ملک (مصر) میں سر اونچا کیا اور اس کے باشندوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ ان میں سے ایک گروہ کو کمزور پاتا تھا، ان کے بیٹوں کو ذبح کرتا اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھتا۔ بیشک وہ (ملک میں) فساد پھیلانے والوں میں سے تھا۔ اور ہم چاہتے تھے کہ ان لوگوں پر احسان کریں جو ملک میں کمزور پائے گئے۔ اور ان کو سردار بنائیں اور ان کو وارث قرار دیں اور ان کو ملک میں اقتدار بخشیں اور ان کے ہاتھوں فرعون و ہامان اور ان کی فوجوں کو وہ چیز دکھا دیں جس سے وہ بچنا چاہتے تھے۔

قدیم صحیفوں میں بھی جا بجا اس بات کا ذکر ملتا ہے کہ خدا نے بنی اسرائیل کو اپنی رحمت سے نوازا تاکہ ان کے آباء و اجداد سے نعمت و برکت کے جو وعدے ہوئے تھے پورے ہوں اور جو منکر ہیں وہ سزا پائیں۔

تثنیہ ۷:۷ میں ہے۔

"خداوند نے جو تم سے محبت کی اور تم کو چن لیا تو اس کا سبب یہ نہ تھا کہ تم شمار میں اور قوموں سے زیادہ تھے کیونکہ تم سب قوموں سے شمار میں کم تھے ۰ بلکہ چونکہ خداوند کو تم سے محبت ہے اور وہ اس قسم کو جو تمھارے باپ دادا سے کھائی پورا کرنا چاہتا تھا اس وجہ سے خداوند تم کو اپنے زور آور ہاتھ سے نکال لایا اور غلامی کے گھر یعنی مصر کے بادشاہ فرعون کے ہاتھ سے تم کو مخلصی بخشی۔ سو جان لے کہ خداوند تیرا خدا وہی خدا ہے۔ وہ وفادار خدا ہے اور جو اس سے محبت رکھتے اور اس کے حکموں کو مانتے ہیں ان کے ساتھ ہزار پشت تک وہ اپنے عہد کو قائم رکھتا اور ان پر رحم کرتا ہے اور جو اس سے عداوت رکھتے ہیں ان کو دیکھتے ہی دیکھتے بدلہ دے کر ہلاک کر ڈالتا ہے۔"

باب ۹: ۵ میں ہے:

تو اپنی صداقت یا اپنے دل کی راستی کے سبب سے اس ملک پر قبضہ کرنے نہیں جا رہا ہے بلکہ خداوند تیرا خدا ان قوموں کی شرارت کے باعث ان کو تیرے آگے سے خارج کرتا ہے تاکہ یوں وہ اس وعدہ کو جس کی قسم اس نے تیرے باپ دادا ابرہام اور اضحاق اور یعقوب سے کھائی پورا کرے ۰ غرض تو سمجھ لے کہ خداوند تیرا خدا تیری صداقت کے سبب سے یہ اچھا ملک تجھے قبضہ کرنے

کے لیے نہیں دے رہا ہے کیونکہ تو ایک گردن کش قوم ہے ۰ تو اس بات کو یاد رکھ اور کبھی نہ بھول کہ تو نے خداوند اپنے خدا کو بیابان میں کس کس طرح غصہ دلایا بلکہ جب سے تم ملک مصر سے نکلے ہو تب سے اس جگہ پہنچنے تک تم برابر خداوند سے بغاوت ہی کرتے رہے۔"

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طُور پر اس لیے بلایا تھا کہ نیکوکاروں کی اولاد پر اپنی نعمت پوری کرے اور ان کو زمین میں سطوت و اقتدار بخشے تاکہ وہ دینِ حق کے گواہ ہوں اور ان کی قوت شریروں اور منکروں کے لیے تازیانہ بنے۔

پس یہ ایک ہی واقعہ رحمت و غضب اور ثواب و عذاب دونوں کا مجموعہ ہے جس کو دوسرے لفظوں میں جزاء اور دینونت سے تعبیر کر سکتے ہیں تاکہ لوگ اللہ تعالیٰ کے عزیز و رحیم اور دیان و حلیم ہونے کے بھید کو سمجھ سکیں۔

۸- بلدِ امین کی شہادت جزاء پر

جزاء کا جو واقعہ مکہ میں پیش آیا اس کی رحمت عالمگیر اور قیامت تک باقی رہنے والی تھی۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو چند باتوں میں آزمایا اور وہ ان میں بالکل پورے اترے۔ یہاں تک کہ اپنے اکلوتے اور سعید فرزند کو بھی اپنے بڑھاپے میں خدا کی راہ میں قربان کرنے پر آمادہ ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو برکت اور حضرت اسحاق کی ولادت کی خوش خبری دی اور ان سے دو وعدے کیے۔ ایک حضرت اسماعیلؑ کی اولاد سے متعلق تھا۔ دوسرا اسحاق علیہ السلام کی اولاد سے۔

جو وعدہ حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد سے متعلق تھا وہ اس وقت پورا فرمایا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طُور پر بلا کر کتاب دی۔ پھر یہود کی مسلسل شرارتوں کے باوجود آلِ اسحٰق پر اپنی اس نعمت کو باقی رکھا یہاں تک کہ انھوں نے اس نبی (حضرت مسیحؑ) کو قتل کر دینے کا ارادہ کر لیا جو ان کے پاس تذکیر و موعظت کا آخری پیام لے کر آیا تھا اور اس طرح انھوں نے اپنا پیمانہ بھر لیا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت ان سے چھین لی۔ اور جزاء کا وہ واقعہ پیش آیا جو بنی آدم کی ایک جماعت کے ساتھ مخصوص اور ایک زمانہ تک کے لیے محدود تھا۔

رہا وہ وعدہ جو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی ذریت کے بارہ میں فرمایا تھا تو اس کو اس وقت اٹھا رکھا تاکہ وہ تمام بنی آدم کے نیکوکاروں کے لیے رحمت اور بدکاروں کے لیے عذاب کا ایک یوم موعود بنے۔ یہ گویا تشریعی دینونت[1] کی آخری عدالت کا ظہور تھا، جس کے بعد صرف قیامت کی عدالت قائم ہونے والی تھی۔ اور چونکہ اس معاملہ کو اتمام و تکمیل کے تمام مراحل سے گزرنا تھا اس وجہ سے ضروری ہوا کہ اس کا انتظار تو روزِ اول سے رہے لیکن اس کا ظہور بالکل آخر میں ہو۔ قرآن مجید اور قدیم صحیفوں میں اس حقیقت کی طرف اشارات ہیں۔ مثلاً:

جس پتھر کو معماروں نے رد کیا۔

---

[1] تشریعی دینونت سے مولانا کی مراد جزاء و سزا کا وہ ظہور ہے جو کسی رسول کی بعثت کے ساتھ ہوتا ہے اور رسول کی طرف سے اس کی قوم پر اتمامِ حجت ہو جانے کے بعد جس کا واضح ہونا ناگزیر ہے (مترجم)

وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا۔
یہ خداوند کی طرف سے ہوا۔
اور ہماری نظر میں عجیب ہے ۰
اور جو اس پتھر پر گرے گا ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا لیکن جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا۔" (متی ۲۱ - ۴۵)

حضرت مسیح علیہ السلام نے جزا کے اس منتظر واقعہ سے متعلق مختلف مثلیں بیان فرمائی ہیں اور اس کو "آسمان کی بادشاہت" سے تعبیر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس بادشاہت کے لوگ گو آخر ہیں مگر اول ہو جائیں گے۔" تاکستان والی مشہور مثال میں یہ الفاظ ہیں۔
"اسی طرح آخر اول ہو جائیں گے اور اول آخر" (متی ۲۰ : ۱۶)

نیز انھوں نے فرمایا کہ حق اور نور کا اتمام اسی دن ہو گا جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے اس وعدہ کے ظہور کا مرکز بلد امین کو قرار دیا جو ہمیشہ دشمنوں کے نرغہ سے محفوظ رہا اور اس کے لیے ایک بہترین امت منتخب فرمائی تاکہ وہ تمام زمین میں اللہ کے حق وعدل کی گواہی دے اور ان میں ایک نبی مبعوث فرمایا جو تمام عالم کے لیے نوید رحمت لے کر آیا اور جس کے ذریعہ سے شریعت وحکمت کا درس بالکل پورا کر دیا گیا کہ جب قیامت کے دن جزا کی میزان قائم ہو تو کسی کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہے۔ قرآن مجید نے یہ تمام امور نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کر دیے ہیں۔ مثلاً فرمایا ہے:

وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ ۖ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا ۖ قَالَ وَمِن ذُرِّيَّتِي ۖ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ ۝ وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى ۖ وَعَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ۝ وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَٰذَا بَلَدًا آمِنًا وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ آمَنَ مِنْهُم بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۖ قَالَ وَمَن كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝ وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ

اور یاد کرو، جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور اس نے پوری کر دکھائیں تو خداوند نے کہا کہ البتہ میں تم کو لوگوں کا امام بناؤں گا۔ ابراہیم نے پوچھا۔ اور میری اولاد میں سے فرمایا میرے اس عہد میں ظالم (مشرک) داخل نہیں ہیں اور یاد کرو جب ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کا مرجع اور امن کی جگہ قرار دیا اور (حکم دیا کہ) ابراہیم کے اس ٹھہرنے کی جگہ کو نماز کی جگہ قرار دو۔ اور ابراہیم اور اسماعیل کو حکم دیا کہ میرے اس گھر کو طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع وسجدہ کرنے والوں کے لیے پاک صاف رکھو۔ اور یاد کرو جب ابراہیم نے دعا مانگی اے میرے پروردگار اس شہر کو امن کا شہر بنا اور اس کے بسنے والوں کو پھلوں کی روزی دے ان کو جو ان میں سے اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائیں۔ فرمایا جو کفر کریں گے تو ان کو چند روزہ فائدہ اٹھانے کی مہلت دوں گا پھر ان کو آگ کے عذاب میں ڈھکیلوں گا اور وہ برا ٹھکانا ہے اور یاد کرو جب

الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۖ إِنَّكَ أَنتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ (بقرہ ۱۲۴-۱۲۵)

ابراہیم اور اسمٰعیل خانہ کعبہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے اور ان کی زبانوں پر یہ دعا جاری تھی کہ اے ہمارے پروردگار ہماری یہ خدمت قبول فرما۔ بےشک تو سننے والا جاننے والا ہے اور اے ہمارے پروردگار ہم کو اپنا بندہ فرمانبردار بنا اور ہماری نسل میں سے ایک فرمانبردار امت بنا اور ہم کو ہماری عبادت کے طریقے بتا اور ہماری توبہ قبول فرما بےشک تو توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے اور اے ہمارے پروردگار ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیج کہ ان کو تیری آیتیں پڑھ کے سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کو پاک کرے بےشک تو غالب حکمت والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا تھا وہ پورا کیا اور ان کو لوگوں کی قیادت اور امامت کا منصب عطا فرمایا۔ چنانچہ اس گھر کی کلید برداری ان کو اور ان کے بیٹے حضرت اسمٰعیل کو سونپی اور اس گھر کو لوگوں کے جمع ہونے کا مرکز اور امن کا گہوارہ قرار دیا۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا قبول فرمائی اور اسی بلد امین میں ایک رسول مبعوث فرمایا۔ یہ سب باتیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کمال عبودیت کے صلہ کے طور پر ظہور میں آئیں اور توریت میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا کہ ان کے ذریعہ سے تمام قوموں کو برکت دے گا۔ چنانچہ یہ تمام پوری ہوئیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد سے لے کر اس وقت تک یہ گھر برابر امن وحفاظت کا مرکز رہا ہے۔ قرآن مجید کے مخاطب اس امر سے اچھی طرح واقف تھے۔ انھوں نے اصحاب فیل کی بربادی کا عبرت انگیز تماشا خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ اس گھر کے خلاف سازش کرنے کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے ان کو کیسی دردناک سزا دی۔

اس کے برعکس ذریت اسحاق کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کا جو وعدہ تھا وہ تو پورا ہوا لیکن ساتھ ہی ان کی شرارتوں کے سبب سے ان کے مرکز یعنی بیت المقدس پر بار بار نہایت ہولناک آفتیں آئیں۔ قدیم صحیفوں میں اس کی تباہیوں کی داستانیں مذکور ہیں۔ تفسیر سورۃ الفیل میں ہم نے بھی ضمناً اس کی طرف بجا اشارات کیے ہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ جزا اور دینونت کا جو عظیم الشان واقعہ بلد امین میں پیش آیا، وہ ایک ہمہ گیر نوعیت رکھتا ہے۔

اوپر کی تمام فصلوں میں جو مباحث آئے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ان مقامات کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس لیے فرمایا کہ ان میں جزا کے واقعات پیش آ چکے ہیں اور اس پہلو سے ان کے اندر جزا کے واقع ہونے پر نہایت اہم شہادتیں مضمر ہیں۔ تاکہ لوگوں میں یہ یقین پیدا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بے مقصد نہیں بنایا ہے اور نہ وہ ان کے حالات سے بے خبر ہے۔ چنانچہ اس نے محض اصلاح وتربیت ہی کے لیے کتابیں اتاری ہیں اور انذار وتبشیر کا سلسلہ برابر قائم رکھا ہے تاکہ انسانی فطرت کے اندر جن مدارج کمال تک پہنچنے کی استعداد موجود ہے ان مدارج تک وہ پہنچ جائے اور اس بات کو اس نے اس امر کی دلیل قرار دیا ہے کہ آخرت میں بھی جزا کا معاملہ ضرور پیش آئے گا۔

۹- تورات سے ایک نظیر اور مقام سعیر کی تحقیق

تورات کا ایک مقام بھی اس سورہ کے ابتدائی حصہ سے ملتا جلتا ہوا ہے اور چونکہ اس میں ہمارے مذکورہ مباحث کی تصریح ہے اس لیے اس کو یہاں نقل کرتے ہیں۔ تثنیہ (۳۳ : ۱-۴) میں ہے۔

"اور مرد خدا موسیٰ نے جو دعائے خیر دے کر اپنی وفات سے پہلے بنی اسرائیل کو برکت دی وہ یہ ہے۔ اور اس نے کہا۔

خداوند سینا سے آیا۔

اور شعیر سے ان پر آشکارا ہوا۔

وہ کوہ فاران سے جلوہ گر ہوا۔

اور قدس کی پہاڑیوں سے آیا[1]۔

اس کے دہنے ہاتھ پر ان کے لیے آتشی شریعت تھی۔

وہ بے شک قوموں سے محبت رکھتا تھا۔"

اس کے بعد خدا سے مخاطب ہو کر کہا ہے۔

"اس کے سب مقدس لوگ تیرے ہاتھ میں ہیں۔

اور وہ تیرے قدموں میں بیٹھے۔

ایک ایک تیری باتوں سے متفیض ہوگا۔

موسیٰ نے ہم کو شریعت

اور یعقوب کی جماعت کے لیے میراث دی۔"

اس کے بعد اپنی قوم کو برکت کی دعا دے کر بات ختم کر دی ہے۔ جو شخص اس پورے سلسلہ کلام پر غور کرے گا وہ اندازہ کر سکتا ہے کہ برکت کی دعا سے پہلے ان باتوں کے کہنے کا کیا مطلب ہے۔ ان باتوں کا صاف صاف مطلب یہی ہے کہ اللہ کی رحمت و برکت ان لوگوں پر ہمیشہ مبذول رہی ہے جنھوں نے اس کی فرمانبرداری کی ہے۔ پس اس قوم پر بھی اس کی برکت و رحمت نازل ہوگی اگر اس نے اللہ تعالیٰ کے احکام و اوامر کی اطاعت کی۔

یہ حقیقت سمجھ لینے کے بعد اس کلام کی اور ہماری بیان کردہ تاویل کی شباہت پوری طرح واضح ہوگئی۔ نیز یہ بات بھی روشن ہوگئی کہ ان مقامات کا ذکر اسی پہلو سے کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قانونِ مکافات کے ظہور کے نہایت نمایاں مقامات ہیں۔ یہ علیحدہ سوال ہے کہ یہ مقامات ٹھیک ٹھیک ان مقامات کے مطابق ہیں یا نہیں جو سورت میں مذکور ہوئے ہیں۔

ہم نے جہاں تک غور کیا ہے ان کی مطابقت بالکل واضح ہے۔ ان چار میں سے تین کے باب میں تو کوئی شبہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ان کی مطابقت تو بالکل ظاہر ہے۔ سینا طور سینین کا دوسرا نام ہے۔ فاران ہمارے تمام علماء کے نزدیک جبال مکہ کا نام ہے۔

[1] یہ فقرہ صرف تورات کے عربی ترجمہ میں ہے۔ ہمارے پیش نظر جو اردو، فارسی اور انگریزی ترجمے ہیں ان میں اس جگہ جو فقرہ ہے اس کا مفہوم اس سے مختلف ہے (مترجم)

تورات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ سورہ صٰفٰت کی تفسیر میں ہم اس پر مفصل بحث کر چکے ہیں۔ "قدس کی پہاڑیوں" سے بیت المقدس کی وہ پہاڑیاں مراد ہیں جو انجیل میں جبلِ زیتون کے نام سے مذکور ہیں اب صرف تین اور سعیر کی مطابقت معلوم کرنا باقی رہ گیا ہے۔ اس پر غور کرنا ہے۔

تیسری فصل میں گزر چکا ہے کہ تین بنی آدم کا اولین مسکن ہے۔ اور تین سے مراد یا تو کوہ جودی ہے یا اسی سے متصل کوئی اور پہاڑ۔ اب ہم تحقیق کا ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ سعیر یہود کے صحیفوں کے بیان کے مطابق جبال ادوم کا نام ہے جن پر قبضہ کرنے سے بنی اسرائیل روک گئے تھے۔ یہ بہت سے سلاطین اور قبائل کا ایک وسیع علاقہ تھا۔ اور عام خیال یہ ہے کہ ادوم، عیص بن اسحاق کا نام ہے۔ ادوم کے معنی سرخی اور گندم گونی کے ہیں۔ چونکہ عیص بن اسحاق نہایت سرخ سپید، قوی ہیکل اور توانا تھے اس وجہ سے ان کا نام ادوم ہوا۔ انہی ادوم کی اولاد سعیر میں آباد تھی۔

ادوم کے جائے وقوع کے بارہ میں سخت اختلاف ہے۔ تورات سے بہت سے مقامات کی طرح اس کے بارہ میں بھی علمائے یہود کے اقوال بالکل مضطرب بلکہ متناقض ہیں۔ مختلف متضاد روایات بغیر کسی تحقیق کے جمع کر دی گئی ہیں۔ ایک طرف تو اس کو شام کے جنوب میں بتاتے ہیں۔ دوسری طرف بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کے ملک کے شمال اور مشرق میں واقع ہے۔ گنتی (۳۴ : ۷) میں ہے۔

"اور شمال سمت میں تم بڑے سمندر (بحر روم) سے کوہ ہور تک اپنی سرحد رکھنا۔"

اور جبل ہور جیسا کہ گنتی (۳۳ : ۳۷) سے معلوم ہوتا ہے، ارض ادوم کے پاس ہے۔

"کوہ ہور کے پاس جو ملک ادوم کی سرحد ہے خیمہ زن ہوئے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بحر روم سے جو خط مشرق کی طرف سے گزرتا ہے وہ ادوم تک پہنچتا ہے جو ارض بنی اسرائیل کے شمال اور مشرق میں واقع ہے۔ اور یہ بات اس تحقیق کے بالکل مطابق ہے جو ہم نے تین کے متعلق کہی ہے۔

بعض روایات بھی ہمارے اس خیال کی تائید کرتی ہیں۔

۱- یہ مشہور ہے کہ ادوم کا ماخذ ادمۃ ہے جس کے معنی سرخی اور گندم گونی کے ہیں۔ اور یہی ماخذ آدم کا بھی ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ ممکن ہے ادوم کا نام ادوم اس لیے پڑ گیا ہو کہ وہ آدم کا اولین مسکن ہے۔

۲- یہ معلوم ہے کہ ادوم سعیر کا دوسرا نام ہے اور سعیر کے معنی عبرانی زبان میں طوفان کے ہیں۔ اس وجہ سے اقرب یہ ہے کہ جودی نام سعیر پڑ گیا ہو۔ اور بنی آدم کا قدیم مسکن وہی تھا۔ یہاں تک کہ جب نوح علیہ السلام کی اولاد زیادہ ہوئی تو وہیں سے منتشر ہو کر مختلف گوشوں میں بٹ گئی۔

۳- یہودی صحیفوں میں کسی ایسے بڑے واقعہ کا پتہ نہیں چلتا جو کسی مقام میں واضح ہوا ہو اور یہود اس کو سعیر سمجھتے ہوں۔ پس ہم نے تین، سعیر اور ادوم میں جو مطابقت دکھائی ہے وہ اقرب علی القیاس ہے۔ واللہ اعلم۔

۱۰- نظائرِ سابقہ نظم و بیان کی روشنی میں

قرآن مجید اور تورات کی مذکورہ بالا نظیروں کی مطابقت سمجھ لینے کے بعد تمھارے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ دونوں کتابوں

میں ان ناموں کی باہمی ترتیب میں فرق کیوں ہوا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید اور تورات میں بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی بات مختلف ترتیبوں کے ساتھ بیان ہوتی ہے اور جس جگہ جو ترتیب اختیار کی جاتی ہے وہ نظم و بیان کی ایک خاص حکمت پر مبنی ہوتی ہے چنانچہ اس مقام میں دونوں صحیفوں میں جو ترتیب ملحوظ ہے وہ بھی ایک گہری حکمت پر مبنی ہے اور ضروری ہے کہ اس پر تھوڑی دیر توقف کر کے غور کیا جائے۔

پہلے قرآن مجید والی ترتیب پر غور کرو۔ اس میں زمان و مکاں اور جمع مثل بالمثل کی ترتیب ملحوظ ہے۔ پہلے آدم علیہ السلام کے واقعہ جزا کو بیان فرمایا کیونکہ تقدم زمانی کے لحاظ سے انہی کا ذکر پہلے ہونا تھا۔ پھر مسیحی دینونت کا ذکر فرمایا اور یہ اس مماثلت کی وجہ سے ہے جو آدم اور حضرت مسیح علیہ السلام کے درمیان ہے اور جس کا ذکر قرآن نے نہایت واضح الفاظ میں کیا ہے۔

اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ (عیسٰی کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی ہے)

پھر انجیر کے درخت کا ذکر یوں بھی نعمت و نقمت اور سلب و بخشش کے مضمون سے ایک گہری مناسبت رکھتا ہے۔ خزاں کے زمانہ میں اس کی برہنگی اور بہار میں اس کی سبز پوشی و دلآویزی اس معاملہ کی ایک مستقل یادگار ہے جو آدم اور ان کی ذریت کے ساتھ پیش آیا۔ اور جس کی طرف چوتھی فصل میں ہم اشارات کر چکے ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی انجیر کے درخت کی مثال بیان فرمائی ہے۔ اس کی برہنگی و ویرانی کے زمانہ کو اپنے جانے اور اپنی امت کی بدبختی کے زمانہ سے تشبیہ دی ہے (دیکھو متی ۲۱۔ ۱۸۔ ۱۹ مرقس ۱۱۔ ۱۱۔ ۱۹۔ لوقا ۱۳۔ ۱۔ ۱۹) اور اس کی سرسبزی و بارآوری کی حالت کو اپنی آمد اور اپنی امت کی سعادت و کامرانی کے دور سے مماثل قرار دیا ہے (متی ۲۴۔ ۳۲۔ ۳۳۔ مرقس ۱۳۔ ۲۸۔ ۲۹۔ لوقا ۲۱ : ۲۵ - ۳۱)

اس کے بعد موسوی اور پھر محمدی دینونت کا ذکر آتا ہے اور موسیٰؑ و محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں جو مماثلت ہے وہ بالکل واضح ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَیْکُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَیْکُمْ — ہم نے تمھارے پاس ایک رسول بھیجا تم پر گواہ بنا کر،
کَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ○ — جس طرح کہ ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا۔

کتاب تثنیہ میں آنحضرت صلعم کی جو مشہور بشارت وارد ہے، یہ مماثلت اس میں بھی اسی طرح نمایاں ہے۔

اور میں ان کے لیے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔ اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا۔ اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے تو میں ان کا حساب اسی سے لوں گا (تثنیہ ۱۸۔ ۱۸۔ ۱۹)

اب گویا ترتیب یوں ہوئی کہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت موسیٰؑ کے ذکر میں تو ترتیب زمانی کا لحاظ ہوا اور حضرت عیسیٰؑ اور حضرت سرور کائنات صلعم کے ذکر میں مماثلت کا اصول ملحوظ رہا یعنی حضرت مسیحؑ حضرت آدمؑ سے مماثل تھے۔ اس وجہ سے ان کا ذکر حضرت آدمؑ کے ساتھ ہوا اور آنحضرتؐ حضرت موسیٰ سے مماثل تھے اس وجہ سے آپ کا ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ملایا گیا۔

اب دیکھو ان مقامات کے ذکر میں مکانی ترتیب کس قدر ملحوظ ہے۔ تین انتہائے شمال و مشرق میں ہے۔ جبل زیتون شام میں ہے۔ طور مغرب و جنوب میں ہے، اور مکہ انتہائے جنوب میں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سفر ہجرت کی ترتیب بھی یہی تھی۔

کلدانیوں کے اور سے نکلے کنعان و مصر آئے اور پھر مکہ پہنچے۔

ایک اور نکتہ بھی قابل لحاظ ہے۔ چوتھی فصل میں ہم لکھ چکے ہیں کہ مقام تین ہی وہ جگہ ہے جہاں نوح علیہ السلام کے زمانہ میں جزا و سزا کا معاملہ پیش آیا تھا اور مکہ وہ جگہ ہے جہاں ابراہیم علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے اپنا عہد باندھا اور حضرت ابراہیمؑ نے اس کے متعلق دعا فرمائی کہ اس کو ایک بلد امین بنا۔ پس اس مقام پر "بلد امین" کے نام سے اس کے ذکر کرنے سے اس عہد کی طرف اشارہ مقصود ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کیا گیا۔ اور اس طرح گویا اس جگہ دینونت کے وہ تمام واقعات بیان ہو گئے جو آدمؑ، نوحؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ ابراہیم اور محمد علیہم الصلوٰۃ والسلام کے زمانوں میں پیش آئے۔ قرآن مجید کی ایک اور آیت میں اسی ترتیب کے ساتھ مذکورہ بالا انبیائے کرام کا ذکر ہوا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤی اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِیْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ — بیشک اللہ نے آدم اور نوح اور آل ابراہیم اور آل عمران کو دنیا والوں پر برگزیدہ کیا۔

پھر تین اور زیتون اور طور سینین اور بلد امین میں ظاہری مناسبت بھی ایسی ہے جو نہایت نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے، نیز تین و زیتون کے ایک ساتھ جمع کرنے میں ایک اور دقیق نکتہ بھی ملحوظ ہے، وہ یہ کہ جس طرح تین حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ دینونت کی طرف اشارہ کر رہا ہے اسی طرح زیتون کا لفظ بھی ان کے عہد کی ایک عظیم الشان برکت کا پیام اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے۔ کیونکہ کتاب پیدائش سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو پانی کے خشک ہونے کی بشارت زیتون ہی کے ذریعہ سے دی گئی۔ مندرجہ ذیل عبارت ملاحظہ ہو۔

اور سات دن ٹھہر کر اس نے اس کبوتری کو پھر کشتی سے اڑا دیا ہ اور وہ کبوتری شام کے وقت اس کے پاس لوٹ آئی اور دیکھا تو زیتون کی ایک تازہ پتی اس کی چونچ میں تھی۔ تب نوحؑ نے معلوم کیا کہ پانی زمین پر سے کم ہو گیا۔ ان اجمالی اشارات کی مدد سے تم سمجھ سکتے ہو کہ اس ترتیب میں مناسبت کے گوناگون پہلو ہیں۔

اب تورات کی ترتیب پر نظر ڈالو، تورات کی مخاطب ایک سادہ لوح قوم تھی، اس وجہ سے اس میں اسلوب بیان تصریح کا ہے۔ چنانچہ فرمایا "خداوند آیا" اور تصویر کا اسلوب بھی نظر آتا ہے۔ مثلاً "چمکا، طلوع ہوا" یہ اسالیب کلام اسی وقت اختیار کیے جاتے ہیں جب کسی مفہوم کو عام فہم و ادراک کے لیے بالکل بے نقاب کر دینا مقصود ہو۔ چنانچہ اسی بنیاد پر تورات نے ان مقامات کے ذکر میں اقرب فی الاقرب والی ترتیب پیش نظر رکھی کیونکہ اس کے اولین مخاطب کسی بات کو اسی ترتیب کے ساتھ آسانی سے سمجھ سکتے تھے۔ پس سب سے پہلے طور کا ذکر کیا۔ یہ ان کی سب سے زیادہ جانی پہچانی ہوئی چیز تھی۔ پھر ایک قدم آگے بڑھ کر سعیر کا ذکر کیا جو حضرت نوح علیہ السلام کی امت کی مجازات کا مقام ہے۔ پھر لوٹ کر آنحضرت صلعم کے ذکر پر آ گئے جو موسیٰ علیہ السلام کے مثل تھے اور جن کا ظہور فاران سے ہونے والا تھا۔ نیز جن کو پہلے سے بشارت دے کر اچھی طرح پہنچوا دیا تھا۔ پھر ایک قدم اور بڑھ کر اس کا ذکر کیا جو آنحضرت صلعم سے پہلے قدس کی پہاڑیوں سے نمودار ہونے والا تھا اور پھر محل و مقام کے مقتضیات کی رعایت دیکھو کہ چونکہ یہود "گردن کش" تھے اس وجہ سے "تین" کا ذکر "سعیر" کے نام سے کیا تاکہ تخویف کا پہلو سامنے رہے اور طوفان کا واقعہ نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ پھر آخر میں یہ بھی فرما دیا کہ اس کے دہنے ہاتھ میں آتشیں شریعت تھی۔

اس آخری ٹکڑے نے رعایت محل و مقام کے تمام تقاضے پورے کر دیے اور گویا کلام پر بلاغت کی آخری مہر ثبت ہو گئی۔

۱۱- مقسم علیہ کی تاویل

(لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ ــــ غَيْرُ مَمْنُونٍ)

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ اس سورت میں مقسم علیہ جزا کا معاملہ ہے۔ یہ چیز قرآن مجید کی متعدد سورتوں میں بحیثیت عمود اور مرکزی مضمون کے بیان ہوئی ہے۔ اس وجہ سے یہاں ہم اس کا اتنا ہی حصہ ذکر کریں گے جتنا موقع و محل کے لحاظ سے ضروری ہے۔ زیادہ تفصیل میں نہ پڑیں گے۔

اللہ تعالیٰ بندوں کے ساتھ جو کچھ کرتا ہے اس کی بنیاد سر تا سر رحمت پر ہوتی ہے۔ چنانچہ اس نے شروع ہی میں انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا اور اپنے خاص لطف و نوازش سے اس کو سرفراز فرمایا لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ انسان کے ساتھ اسی مخصوص فضل و کرم کا تقاضا یہ ہوا کہ اگر وہ نافرمانی اور ناشکری کی روش اختیار کرے تو اس کو سزا بھی ملے چنانچہ تاریخ کے ہر دور میں جزا کے یہ واقعات پیش آئے۔ مگر یہ جزا کوئی ظلم و ناانصافی نہیں ہے۔ یہ بھی ظہور رحمت ہی کا ایک پہلو ہے بلکہ اس سے جو رحمت ظہور میں آتی ہے، وہ بالکل کامل ہوتی ہے۔ پس جزا کی اصل بنیاد بھی رحمت ہی ہے اور اس کے نتائج و ثمرات بھی رحمت ہیں۔

اسی اصول پر مقسم علیہ میں انسان کے تین مرتبے بیان فرمائے ہیں۔ اول، اوسط، آخر اور نوعی حیثیت سے اس کو جو حالت پیش آتی ہے اس کی خبر دی اور حقیقت کو نمایاں کرنے کے لیے حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ کو مثال ٹھہرایا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین ساخت اور نہایت مستقیم فطرت پر پیدا کیا۔ اس کو آزاد اور کامل بنایا۔ خیر اور شر کی تمیز کے لیے اس کو الہام کی روشنی بخشی۔ اور ارادہ اور فعل دونوں میں اس کو بالکل خود مختار بنایا۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا	اور نفس کی اور اس کے تسویہ کی قسم پس اس کو الہام کی اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری۔

تاکہ وہ خود اپنے اختیار سے نفس کی برائی کے پہلو کو دبائے اور تقویٰ کے پہلو کو اختیار کرے۔ یعنی اس کی اطاعت و بندگی آزادانہ و خود مختارانہ ہو، محکومانہ و مجبورانہ نہ ہو اور یقیناً یہ اطاعت و بندگی اس اطاعت و بندگی سے بدرجہا افضل ہے جس کے لیے کوئی مخلوق مجبور کر دی گئی ہو۔ انسان کے اسی مرتبہ خصوصی کی طرف یہ آیت اشارہ کر رہی ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ	بے شک ہم نے آدمی کی ساخت اچھی سے اچھی بنائی۔

انسان کی ساخت اچھی سے اچھی بنانے کا کیا مطلب ہے؟ یہ مطلب ہے کہ ایک طرف تو اس میں خیر و شر کے دو متضاد و متقابل میلانات رکھے۔ دوسری طرف اس کو خیر و شر کا علم عطا فرمایا اور پھر اس کی اصل فطرت محبت خیر کے سانچہ میں ڈھال لی۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ انسانی قویٰ کی تربیت و اصلاح اور ان کا عروج و کمال جد و جہد پر منحصر رہے۔ اس مقصد کے لیے یہ ضروری ہوا کہ انسان کو اختیار و ارادہ رکھنے والی مخلوق بنایا جائے تاکہ کھرے اور کھوٹے میں امتیاز کی ایک بنیاد قائم ہو سکے۔ یہی تزکیہ اور ابتلاء

کی حقیقت ہے۔ اگر یہ سعی اور جد و جہد کا قانون نہ ہوتا تو انسان اس رتبۂ کمال کو نہ پہنچ سکتا جو اللہ تعالیٰ نے اس کی فطرت میں ودیعت کیا ہے اور جس کی وجہ سے وہ علم و عمل اور حکمت و پاکیزگی کی ایک بہترین مخلوق قرار پایا ہے۔

پھر چونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ارادہ و اختیار کی حکمت سے سرفراز فرمایا اس وجہ سے اس کے ساتھ وہ معاملہ کیا جو ایک آزاد و با اختیار مخلوق کے شایان شان ہے، یعنی اس سے اطاعت و بندگی کا عہد لیا۔ اس کو مجبور و محکوم نہیں بنایا۔ اور اس طرح وہ جزا و سزا کا مستحق ٹھہرا۔ چنانچہ جب اس نے اپنے بودے پن کی وجہ سے اس عہد کو بھلا دیا، جیسا کہ قرآن مجید میں وارد ہے۔ وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (اور ہم نے آدم سے عہد لیا اس سے قبل تو وہ بھول بیٹھا اور ہم نے اس میں ارادہ کی پختگی نہیں پائی) تو اس کو قانون مکافات سے دوچار ہونا پڑا۔ چنانچہ فرمایا ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ (پھر ہم نے اس کو ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ میں ڈال دیا)

لیکن چونکہ انسان پر برائی اور بھلائی دونوں کے الہام کے دروازے بھی کھول دیے گئے تھے، اس وجہ سے اس کے واسطے توبہ کی دستگیری بھی موجود رہی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کو توبہ کے کلمات تلقین فرمائے اور جب اس نے توبہ کی تو اس کی توبہ قبول فرمائی فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ (اور آدم نے اپنے رب سے کچھ کلمات سیکھ لیے تو اس کے رب نے اس کی توبہ قبول فرمائی) اور اس گڑھے سے جب وہ نکلا تو پہلے سے زیادہ سرخرو اور باعزت ہو کر نکلا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس کو محبوب و برگزیدہ ٹھہرایا۔

وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى	اور آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی، پس وہ بھٹک گیا، پھر اس کے رب نے اس کو برگزیدہ کیا، پس اس کی توبہ قبول کی اور ہدایت دی۔

پہلی مجازات کے بعد یہ مجازات کا دوسرا معاملہ تھا اور جس طرح پہلا معاملہ صرف آدم کے لیے مخصوص نہیں ہوا بلکہ ان کی تمام ذریت کے لیے عام ہوا اسی طرح یہ دوسرا معاملہ بھی ان کی تمام ذریت کے لیے عام ہوا یعنی لغزش کے بعد جو بھی توبہ کرے گا اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمائے گا اور اس کو ہدایت بخشے گا۔ چنانچہ فرمایا:

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ	ہم نے کہا اترو اس میں سب، پس اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے ان پر نہ تو کوئی خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ توبہ کی تلقین جس طرح آدم پر نازل ہوئی اسی طرح انبیاء کے واسطہ سے ان کی ذریت پر بھی ان کے نازل کرنے کا وعدہ کیا گیا اور یہ فرمایا گیا کہ جو اس کو قبول کر لیں گے وہ آدم کے طریقہ پر ہوں گے اور جو نعمتیں ان سے ان کے گناہوں کے باعث چھن گئی ہوں گی وہ اس توبہ کے بعد ان کو دوبارہ بخش دی جائیں گی۔ بلکہ وہ پہلی نعمتوں سے زیادہ افضل و اعلیٰ نعمتیں پائیں گے۔ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ (ہاں مگر جو ایمان لائے اور جنھوں نے بھلائیاں کیں۔ تو انھیں ہمیشہ کے لیے انعام ملے گا)۔

ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ انسانی احوال کے تین درجے ہیں۔ قرآن مجید کی ایک اور آیت سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ (الاحزاب: ۷۲-۷۳)	بے شک ہم نے آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر امانت پیش کی پس انھوں نے اس کو اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا بیشک وہ ظلوم و جہول[1] ہے تاکہ اللہ عذاب دے منافق مردوں اور منافق عورتوں کو اور مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو اور اللہ توبہ قبول کرے ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کی اور اللہ بخشنے والا اور رحم والا ہے۔

انسان نے یہ امانت اس لیے اٹھائی کہ اس کے لیے وہ پوری استعداد رکھتا تھا لیکن چونکہ اس استعداد کے ساتھ لغزشیں، ٹھوکریں اور گرنے، اور گر کر پھر سنبھلنے کی آزمائشیں بھی تھیں اس وجہ سے وہ ظلوم و جہول ٹھہرا۔ مگر انھیں آزمائشوں کے اندر اس کی اصلی کامیابیاں بھی پوشیدہ ہیں جو ٹھوکروں کے بعد اٹھتے ہیں وہ آدم کی طرح برگزیدگی کی نعمت و عزت سے سرفراز ہوتے ہیں۔

ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ یہ تینوں آیتیں انسان اور اس کی مجازات کے ان تمام معاملات پر مشتمل ہیں جو اس کو بدء خلقت سے لے کر اخیر مرحلہ زندگی تک پیش آتے ہیں اور ان میں ایک ہلکا سا اشارہ حضرت آدمؑ کے ہبوط کے واقعہ کی طرف بھی ہے چنانچہ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ سے ان کی اس وقت کی حالت مراد ہے جب وہ اس دنیا کی طرف لوٹائے گئے ہیں۔ اس تاویل میں حرف "الا" استدراک کے لیے ہوگا اور معنی یہ ہوں گے کہ جو لوگ اہل ایمان ہیں وہ ہبوط کے بعد ترقی کریں گے اور دائمی اجر سے سرفراز ہوں گے۔

جو لوگ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ سے صرف کفار کی حالت کا بیان سمجھتے ہیں وہ "الا" کو استثناء متصل کے مفہوم میں لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک تاویل یہ ہوگی کہ انسان کو بہترین ساخت پر بنانے کے بعد ہم نے اس کو اسفل سافلین میں لوٹا دیا مگر وہ جو ایمان لائے اور جنھوں نے بھلائیاں کیں تو یہ لوگ پہلی حالت سے لوٹائے نہیں جائیں گے۔

یہ آخری تاویل تنگ اور بعید ہے کیونکہ نہ تو یہ انسان کی عام حالت سے مطابق ہے نہ اس میں آدم کے قصہ کی طرف کوئی اشارہ ہے۔ اس میں لوٹائے جانے کی حالت کفار کے ساتھ مخصوص ہو جاتی ہے۔ البتہ دوسری تاویل وسیع اور جامع ہے اور اوپر ہم نے اس کی جو نظیر پیش کی ہے اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کیونکہ "ظلوماً جہولا" صرف کفار کے لیے مخصوص نہیں ہے چنانچہ اس کے بعد مومنین و کفار میں تفریق کی ہے۔

---

[1] اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا۔ انسان ظلوم ہے یعنی عمل کی جہت سے۔ چنانچہ اس نے ایک بڑی ذمہ داری اپنے سر لے کر اپنے آپ کو بے شمار خطرات میں ڈال دیا۔ جہول ہے، یعنی علم کے پہلو سے۔ چنانچہ اس نے ایک ایسا معاملہ کی جرأت کی جو نہایت خوفناک تھا اور اگر اس کو اس کی اصل حقیقت معلوم ہوتی تو اس سے ڈرتا اور اس کے پاس نہ پھٹکتا۔ لیکن درحقیقت انھی دونوں باتوں کے اندر اس کی ترقی کا اصل راز مضمر تھا کیونکہ کامیابیوں کی راہ خطرات کی وادیوں ہی سے ہو کر گزری ہے۔ آگے لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ الآیہ بطور نتیجہ ہے (منہ)

یہ لحاظ رہے کہ ان دونوں تاویلوں کا احتمال اس وقت ہے جب کہ "اسفل سافلین" میں ترکیب اضافی مانی جائے، ورنہ اگر سافلین کو حال قرار دو، جو زیادہ مناسب ہے، تو 'اسفل' کو خواہ ظرف قرار دو یا حال، وہ عام ہوگا اور آدم کے ہبوط کے قصہ کی طرف اشارہ کرے گا اور اس صورت میں استثناء اسی سے ہوگا۔

باقی رہا 'سافلین' تو اس میں بھی دو صورتیں ہوں گی۔ ایک یہ کہ اس کو بھی عام قرار دو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پستی کی طرف نہیں لوٹایا مگر اس وقت جب کہ انسان نے خود اپنے لیے پستی پسند کی۔ اس صورت میں حرف 'الا' استدراک کے لیے ہوگا اور مفہوم یہ ہوگا کہ لیکن مومنین ہبوط و تسفل کے بعد سنبھلے اور توبہ کی پس ان کے لیے دائمی اجر ہے۔ یہ تاویل جیسا کہ ظاہر ہے نہایت عمدہ ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مومنین کو 'سافلین' سے علیحدہ کر لو۔ اس صورت میں استثناء متصل ہوگا اور مطلب یہ ہوگا کہ مومنین باوجود ہبوط کے سافل نہ ہوں گے بلکہ وہ پستی سے بلندی کی طرف چڑھیں گے البتہ کفار اسی حالت میں پڑے رہیں گے اور ان کی پستی روز بروز بڑھتی ہی جائے گی۔

۱۲- فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ——— بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ کی تاویل

اس آیت کی تاویل میں دو قول ہیں۔

ایک یہ کہ پس اے انسان اس کے بعد کیا چیز ہے جو جزا کے بارہ میں تیری تکذیب کرتی ہے۔ یہ تاویل مجاہدؒ نے اختیار کی ہے چنانچہ جب ان سے کہا گیا کہ اس میں مخاطب آنحضرت صلعم ہیں تو انھوں نے فرمایا، معاذ اللہ یہ کیسے ہو سکتا ہے، اس میں مخاطب انسان ہے۔ زمخشری نے بھی یہی تاویل اختیار کی ہے لیکن وہ "يُكَذِّبُكَ" میں تکذیب کے معنی حمل علی التکذیب یعنی تکذیب پر ابھارنے کے لیتے ہیں۔ اگر یہ معنی لغت سے ثابت ہو جائیں تو یہ تاویل نہایت واضح ہے لیکن اس کی تائید میں انھوں نے کوئی دلیل نہیں پیش کی ہے۔

دوسری تاویل یہ ہے کہ پس اے پیغمبر اس کے بعد کیا چیز ہے جو جزا کے بارہ میں تمھاری تکذیب کرتی ہے۔ فراء نے یہی تاویل اختیار کی ہے۔ اس حد تک تو یہ تاویل بالکل صحیح ہے کہ اس میں لفظ کے مشہور معنی سے انحراف نہیں ہے لیکن سیاق کلام اور موقع استفہام کے لحاظ سے یہ تاویل صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ دو دو استفہاموں کے ساتھ یہاں آنحضرتؐ کو مخاطب کرنے کا کوئی صحیح پہلو سمجھ میں نہیں آتا اور "فَمَا يُكَذِّبُكَ" کا زور اور لفظ 'بعد' کی تاکید تو یہ تاویل لینے کی صورت میں بالکل مخفی رہ جاتی ہے۔ پس سیاق اور حسن نظم سے اقرب تاویل وہی ہے جو مجاہدؒ نے اختیار کی ہے۔ اس میں لفظ اپنے اصلی مفہوم پر باقی رہتا ہے اور اس کے ان دونوں معانی کے لحاظ سے جو اوپر ہم بیان کر چکے ہیں یہاں دو تاویلیں نہایت محکم اور خوبصورت بن جاتی ہیں۔

۱- ایک یہ کہ اے انسان ان شہادتوں کے بعد اب کون سی شہادت اور دلیل ہے جو وقوع جزا کے بارہ میں تیرے عقیدہ کی تکذیب کرتی ہے۔ اس صورت میں مخاطب انسان ہوگا اور جو لوگ جزا پر یقین رکھنے والے ہوں گے ان کو اس کلام سے تقویت و تائید حاصل ہوگی اور جو لوگ جزا کے بارہ میں مذبذب ہوں گے ان کو اس چیز پر غور کرنے کا شوق ہوگا۔

پھر لفظ "ما" کے حسن استعمال پر غور کرو، اس نے انسانی ضلالت کی اصل حقیقت بے نقاب کر دی ہے۔ اس سے اس حقیقت

کی طرف صاف اشارہ ہوتا ہے کہ انسان نے انکار کی راہ ہمیشہ تقلید و عناد کی بنا پر اختیار کی ہے۔ دلائل و شہادت نے کبھی اس راہ میں اس کا ساتھ نہیں دیا ہے۔ دلائل اور شہادتوں کی اس پوری کائنات میں ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے جو مجازات کے انکار پر آمادہ کر رہی ہو۔ اس وجہ سے انسانوں کو مخاطب کر کے یہ دعوت دی کہ وہ تقلید سے ہٹ کر دلائل پر غور کریں اور دیکھیں کہ کیا یہاں ایک چیز بھی ایسی ہے جو وقوع جزا کے اعتقاد کو غلط ثابت کر رہی ہو؟

۲ — دوسری یہ کہ واقعات و دلائل کی ان شہادتوں کے بعد وہ اوہام اور آرزوئیں کیا ہیں جو جزا کے بارہ میں انسان کے دل میں پیدا ہو رہی ہیں۔

اس صورت میں روئے سخن منکرین کی طرف ہوگا۔ قرآن مجید میں اس قسم کے خطابات کی نظیریں موجود ہیں۔

يَاأَيُّهَا الْإِنسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ

اے انسان تجھ کو تیرے رب کریم کے بارہ میں کس چیز نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔

قرآن مجید نے بعض جگہ جزا کے بارہ میں منکرین کے ظن کو نقل کیا ہے۔ اس سے بھی مذکورہ بالا مفہوم کی تائید ہوتی ہے مثلاً

إِن نَّظُنُّ إِلَّا ظَنًّا وَمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِينَ

نہیں ہم کرتے ہیں مگر ایک گمان اور ہم یقین لانے والے نہیں ہیں۔

یہ دونوں تاویلیں نہایت واضح اور خوبصورت ہیں۔ واللہ اعلم۔

اب دونوں استفہاموں کے مقصد پر غور کرنا چاہیے۔ پہلے استفہام کا مقصد دونوں تاویلوں کی صورت میں یہ ہوگا کہ مجازات کے اس قدر دلائل و براہین واضح ہو جانے کے بعد انسان کو چاہیے کہ اس کا اقرار کرے اور ان تمام شبہات کو اپنے سے بچائے جو لوگوں کی طرف سے یا خود اس کے اپنے نفس کی طرف سے اس کے دل میں پیدا کیے جا رہے ہیں۔

دوسرے استفہام کا مقصد یہ ہے کہ لوگ مجازات کا اقرار کریں اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے صفات میں سے ہے۔ گویا پوری بات یوں فرمائی گئی ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ تمام حاکموں سے بڑھ کر حاکم نہیں ہے۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ وہ انسانوں کو یونہی چھوڑ دے گا۔ اور اچھوں اور بروں میں کوئی امتیاز نہ کرے گا۔ أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ۝

۱۳ — سورہ کا نظم سابق و لاحق سے اور بعثتِ محمدی کا اثبات

اس سورہ سے پہلے جو دو سورتیں ہیں۔ ان میں اس بعثت عظمیٰ کی، جس کا سنگ بنیاد حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام کے ہاتھوں رکھا گیا، ان ذمہ داریوں کی طرف اشارہ ہے جو آنحضرت صلعم پر ڈالی گئی تھیں اور جن کو ادا کرنے کے لیے شہر مکہ کو دشمنوں کے کید سے اللہ تعالیٰ نے محفوظ بنایا اور حضرت ابراہیمؑ نے اس میں اپنی ذریت کو آباد کیا اور باوجودیکہ ایک عرصہ تک یہ مقدس گھرانا ایک گوشہ گمنامی میں پڑا رہا لیکن اللہ تعالےٰ نے اس کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ اس نے اپنا آخری نبی اس کے اندر مبعوث فرمایا جس نے تمام عالم کو نورِ ہدایت سے معمور کر دیا اور جس کے ذریعہ سے وہ مقاصد پورے ہوئے جو اس مقدس شہر کی تعمیر کے وقت پیش نظر تھے۔ یعنی یہ کہ اللہ کی خالص توحید اور غریبوں اور مسکینوں کی اعانت و ہمدردی کا ایک مرکز بنایا جائے۔

اللہ تعالیٰ کے علم و حکمت میں کوئی ساجھی نہیں ہے۔ اس نے ہر کام کے لیے ایک مدت متعینہ ٹھہرا رکھی ہے۔ چنانچہ سورہ تین میں اسی حقیقت کو بیان فرمایا ہے کہ دیکھو اللہ تعالیٰ کس طرح علم و حکمت کے ساتھ انسانوں کے درمیان عدالت کرتا ہے اور ان کے درمیان ایک امت کے بعد دوسری امت کھڑی کرتا ہے اور اس کو اپنی امانت سونپتا ہے۔ ایک قوم پامال و ذلیل کر دی جاتی ہے اور دوسری بلند و فتحمند کی جاتی ہے تاکہ اس نے اللہ تعالیٰ کے عہد امانت کے ساتھ جس طرح کا معاملہ کیا ہے اسی طرح کا بدلہ پائے۔

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ الْعِقَابِ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝

اور وہی ہے جس نے تم کو بنایا زمین میں جانشین۔ اور بعض کے درجے بعض پر بلند کیے تاکہ تم کو آزمائے اس چیز میں جو تم کو بخشی ہے۔ بے شک تیرا رب جلد بدلہ دینے والا ہے اور وہ بے شک بخشنے والا اور رحم والا ہے۔

پس اس سورہ میں بعض ان برکتوں کی نشانیوں کی طرف اشارہ فرمایا جو اس مقدس شہر میں ظاہر ہوئیں اور اسلوب بیان ایسا اختیار فرمایا ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ معاملہ ایک ایسے بندھے ٹکے قانون کے مطابق ہوا ہے جو عالم انسانی کے اندر ہمیشہ سے جاری ہے۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ اس سورہ کا مقصد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو ثابت کرنا ہے اور اس کے لیے طریق استدلال دلیل لمی کا اختیار کیا گیا ہے یعنی چونکہ اللہ تعالیٰ دیان اور احکم الحاکمین ہے اس وجہ سے ضروری ہوا کہ وہ اپنا آخری نبی بھیج کر اس دنیا کی عدالت کرے۔

اور پھر یہی بات یہیں تاریخی استدلال سے بھی ثابت کی گئی ہے۔ یہاں سیاق کلام خود بخود اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ سلسلہ کی تمام کڑیاں موجود ہیں صرف آخری کڑی کی جگہ خالی ہے۔ یا حضرت مسیح علیہ السلام کے لفظوں میں پورا قصر تو تعمیر ہو چکا ہے صرف کونے کی آخری اینٹ کا انتظار ہے (حضرت مسیح علیہ السلام کے الفاظ کی تائید حدیث صحیح سے بھی ہوتی ہے) پس یہاں مکہ کا ذکر بلد امین کے لفظ سے کیا تاکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کی طرف اشارہ ہو جائے جو انھوں نے آنحضرت صلعم کی بعثت اور ایک امت مسلمہ کے ظہور سے متعلق فرمائی تھی چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلعم کو مبعوث فرمایا تو آپ کو صرف ایک ہی بات کا حکم فرمایا کہ آپ دین حنیفی کو قائم کریں اور لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں اور اس کام کا طریقہ بھی خود ہی متعین فرما دیا۔ یعنی تلاوتِ آیات، تعلیم شریعت، تعلیم حکمت اور تزکیہ۔ اور یہ طریقہ بعینہ وہی طریقہ ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا میں مذکور ہے جو بیت اللہ کی تعمیر کے وقت ان کی زبان پر جاری ہوئی تھی۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ

اور ہم کو بنا اے ہمارے پروردگار اپنا فرمانبردار اور ہماری ذریت میں سے اپنی ایک فرمانبردار امت بنا اور ہم کو بتا ہماری عبادت کے طریقے اور ہماری توبہ قبول فرما بیشک تو توبہ قبول کرنے والا اور رحم والا ہے اور اٹھا ان میں اے ہمارے پروردگار انہی کے اندر سے

الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (البقرہ: ۱۲۸-۱۲۹)

ایک رسول جو سنائے ان کو تیری آیتیں اور سکھائے ان کو کتاب اور حکمت اور ان کو پاک کرے بیشک تو غالب حکمت والا ہے۔

قرآن کی ایک اور آیت بھی بلدامین، اسلام اور تلاوتِ قرآن کے باہمی تعلق کو پوری طرح واضح کر رہی ہے، اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس آخری بعثت کے اصلی مقاصد درحقیقت یہی چیزیں ہیں۔ فرمایا:

اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِيْ حَرَّمَهَا وَلَهٗ كُلُّ شَيْءٍ ۡ وَّاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ (النمل: ۹۱-۹۲)

مجھے تو محض اس شہر کے رب کی پرستش کا حکم ملا ہے جس کو اس نے محترم بنایا اور اسی کے قبضہ میں سب کچھ ہے اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں فرمانبرداروں میں بنوں اور یہ کہ قرآن پڑھ کر سناؤں۔

چنانچہ اسی ربط کے لحاظ سے اس بلدامین والی سورہ کے بعد سورۂ اقرا لائے جو گویا تلاوت قرآن کی سورہ ہے اور جس میں نعمت قرآن کو انسان کی خلقت کی غایت اور اس کے احسن تقویم پر ہونے کی دلیل قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ (خدا کا نام لے کر پڑھ جس نے بنایا) پھر فرمایا عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (آدمی کو وہ شے سکھائی جو وہ نہ جانتا تھا) اسی کے ہم معنی سورہ رحمٰن کی ابتدائی آیات بھی ہیں اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (رحمٰن، جس نے سکھلایا قرآن، بنایا انسان کو، سکھایا اس کو بیان)

اس سے معلوم ہوا کہ انسان کی خلقت کی طرح قرآن مجید بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مظاہر میں سے ہے۔ چنانچہ قرآن کی تعلیم اور انسان کی خلقت کو یہاں ایک ساتھ بیان فرمایا ہے اور ایسا ہونا ضروری تھا کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ وہ ہر چیز پر اس کی صلاحیت و استعداد کے اعتبار سے انعام و اکرام فرماتا ہے۔ اس وجہ سے انسان کا احسن تقویم یعنی بہترین ساخت پر ہونا مقتضی تھا کہ وہ قرآن کی نعمت سے سرفراز ہو کیونکہ یہی درحقیقت اس کا احسن تقویم کی طرف لوٹنا ہے اور اسی سے اس کا وہ کمال ظہور میں آسکتا ہے جو اس کی فطرت کے اندر ودیعت ہے۔